ماہنامہ

جہد حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

HRCP

Monthly JEHD-E-HAQ - September 2015 - Registered No. CPL-13

جلد نمبر 22...... شمارہ نمبر 09...... ستمبر 2015..... قیمت 5 روپے

منتخب بلدیاتی ادارے جمہوریت کی روح ہیں

کچی بستی

توقیر گیلانی

یہاں سے نکلو

یہاں سے نکلیں.. کہاں پہ جائیں؟

کہیں بھی جائو، یہاں سے نکلو

مگر ہمارے تو گھر یہی ہیں.....!

تمہارے گھر تھے، پر اب نہیں ہیں

ہمارے دستِ ہوس کی دستک تمہاری بستی پہ ہو چکی ہے

کواڑ کھولو، اٹھائو گٹھڑی، یہاں سے نکلو

مگر.....

اگر مگر کچھ نہیں چلے گا

ہٹائو اپنے یہ لال پرچم

انہیں بھی گٹھڑی میں ساتھ رکھو

اگر کہیں جھونپڑی بنالی تو اس کی منڈیر پر لگانا

یہاں مت آنا

یہاں تمہاری غلیظ بستی کے نقش تک بھی نہیں ملیں گے

یہاں بنائیں گے ہم پلازے، حسین بنگلے، امیر بچوں کی درس گاہیں

نفیس ہوٹل

تمہارے بیکار، زرد خوابوں کے سبز مقتل

کہ جن پہ لہرائے گا ہمارا یہ سبز پرچم

یہ پرچموں میں عظیم پرچم

عطائے رب کریم پرچم

(بشکریہ: لیبر ایجوکیشن)

لاہور، 21 اگست 2015: ایچ آر سی پی نے 'جی ایس پی پلس اور پاکستان کی ذمہ داری' کے عنوان پر تقریب کا اہتمام کیا

لاہور، 22 اگست 2015: ایچ آر سی پی نے 'پولیس اصلاحات میں تاخیر' پر ایک تقریب کا انعقاد کیا

اسلام آباد، 29 اگست 2015: ایچ آر سی پی نے 'پاکستان میں ڈیزاسٹر مینجمنٹ' کے موضوع پر مشاورت کا اہتمام کیا

ملتان، 12 اگست 2015: ایچ آر سی پی نے 'نوجوانوں کے عالمی دن' کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا

اسلام آباد میں اراضی واگزار کروانے کی مہم میں ذمہ دارانہ انداز اختیار کیا جائے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سیکٹر آئی الیون (I-II)، اسلام آباد میں تجاوزات مخالف آپریشن میں مصروف حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ذمہ دارانہ انداز میں کارروائی کریں اور بے دخل ہونے والے لوگوں کی رہائشی ضروریات پر توجہ دیں۔

کمیشن نے اپنے ایک بیان میں کہا: ''ایچ آر سی پی تجاوزات کو جائز قرار نہیں دیتا اور اراضی کو غیر قانونی قبضے سے واگزار کروانے کی ضرورت کو بخوبی سمجھتا ہے۔ تاہم، کمیشن کا سیکٹر I-II کی کارروائی میں مشغول حکام سے مطالبہ ہے کہ وہ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ ان کارروائیوں سے بے دخل ہونے والے لوگ کہاں جائیں گے۔

حکام یقیناً اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ آج خالی کروائی جانے والی کچی آبادیاں کوئی مثالی قیام گاہ نہیں ہیں اور وہاں رہائش پذیر لوگوں کے پاس کوئی اور چارہ ہوتا تو وہ وہاں ہرگز رہائش اختیار نہ کرتے۔ نہایت احترام کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حکام اس حقیقت سے صرف نظر کر رہے ہیں کہ جھونپڑیوں سے بے دخل ہونے والے لوگ کہیں غائب نہیں ہو جائیں گے۔ انہیں کسی اور جگہ اپنے لئے گھر تلاش کرنا پڑے گا۔ جس انداز سے یہ کارروائی کی جا رہی ہے اس کی بدولت ریاست اپنے شہریوں کو رہائش اور دیگر سہولیات کی فراہمی کے فریضے کو بھی نظر انداز کر رہی ہے۔

ہم پُر امید ہیں کہ حکومت اس کارروائی کے ساتھ ساتھ بے دخل ہونے والے گھرانوں کی آبادی کے طرائق کار پر غور کرے گی اور انہیں مناسب اور متبادل رہائش فراہم کرے گی۔ اس قسم کے اقدام کو تجاوزات کے خلاف موقف میں نرمی کے طور پر نہیں لیا جائے گا۔ اس کے برعکس، اسے اپنے فرائض سے آشنا حکومت کی طرف سے ایک مہذب اور بامروت اقدام سمجھا جائے گا۔ ایچ آر سی پی کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ اُن لوگوں کے لیے باضابطہ قانونی کارروائی کو یقینی بنایا جائے جنہیں اپنے گھروں کی مسماری کے خلاف مزاحمت کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔

مزید برآں، کچی آبادیوں میں جرائم پیشہ عناصر کی موجودگی کے امکانات کے باعث سیکٹر I-II میں کارروائی ضروری تھی تو محض 'مجرموں' کو منتشر کرنا کوئی معقول اقدام نہیں ہے۔ اس مسئلے کا دوسرا پہلو کچی آبادیوں کے افغان اور غیر افغان مکین ہیں۔ اس حوالے سے، بے دخل افغانوں کو جس صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا، اسے بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ ان میں سے بیشتر پناہ گزین کیمپوں میں منتقل ہو جائیں گے۔ انہیں کیمپوں میں منتقل کرنا سب سے بہتر اقدام ہی کیوں نہ ہو، یہ ایک عارضی حل ہے اور اس سے وطن واپسی کی پالیسی میں پائے جانے والے نقائص کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 02 اگست 2015]

بین الاقوامی سطح پر شفقت کی پھانسی کے نتائج بے حد منفی ہوں گے

کراچی سنٹرل جیل میں 4 اگست کی صبح کو شفقت حسین کی پھانسی کی سزا پر عملدرآمد کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شفقت حسین نے جس وقت جرم کا ارتکاب کیا تھا، اس وقت وہ نابالغ تھا۔ اس بنیاد پر انسانی حقوق سے متعلق تنظیموں، یورپی یونین اور اقوام متحدہ کے حکام کے علاوہ سول سوسائٹی نے شفقت کو پھانسی نہ دینے کا مطالبہ کیا تھا جس پر چار مرتبہ اس کی سزا پر عملدرآمد روکا گیا تھا لیکن ان تمام تنظیموں کی اپیلوں اور مطالبات پر کان نہ دھرتے ہوئے بین الاقوامی قانون سے سرکشی کرتے ہوئے آخر کار 4 اگست کی صبح کو شفقت حسین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

شفقت حسین کی سزا پر عملدرآمد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی چیئرپرسن اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی وفاق کی نائب صدر زہرہ یوسف نے کہا کہ شفقت حسین کی پھانسی قانون کی حکمرانی اور بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے پاکستان کی بے التفاتی اور لاپروائی کی تازہ ترین مثال ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھانسی کی سزا کے آغاز نو، خصوصاً نوعمر مجرموں کو پھانسی دینے کے عمل کا دوبارہ آغاز پاکستان کی شہرت پر ایک دھبہ ہے اور اس کو فوری طور پر روکا جانا چاہئے۔

فہرست

ایچ آر سی پی کی جاری کردہ پریس ریلیزیں	5-7
طبی سہولیات کے فقدان پر تشویش کا اظہار	8
بچوں کے حقوق سے چشم پوشی	9
انتخابی افراتفری	10
جبری گمشدہ افراد سے ہمدردی کا عالمی دن	11
ریاستی ناکامی کی طویل داستان کا نیا باب	16
کاری، کارو کہہ کر مار ڈالا	16
قانون نافذ کرنے والے ادارے	17
انتہا پسندی کی روک تھام اور رواداری کے فروغ کے لیے منعقدہ تربیتی ورکشاپس کی رپورٹس	19
اقلیتیں	27
قصور میں بچوں سے جنسی زیادتی کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ	29
پاکستان میں حفاظتی قوانین کی صورتحال	34
یوم آزادی پر سوچ بچار	35
جب پولیس افسر فرض شناس ہوں	36
''اچھے طالبان'' کو پھر خوش آمدید	37
پاکستانی صنعتوں کے لیے جی ایس پی پلس سکیم کے فوائد	38
قصور کی روبینہ بی بی کو انصاف کون دے گا؟	39
جنسی تشدد کے واقعات	40
خودکشی کے واقعات	45
مرمر کی رگوں میں زیتون کی جڑیں	49
انتہا پسندی سے پاک معاشرے کا قیام	50
ایچ آر سی پی: ایک شاندار کتاب	51

خیال کیا جاتا ہے کہ 2004ء میں جب قتل کے الزام میں شفقت حسین گرفتار ہوا اور اس کو انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے موت کی سزا سنائی تھی تو اس وقت وہ 14 برس کا تھا۔ اس کی سزا پر عملدرآمد کے احکامات جاری کئے گئے تھے لیکن بعد کے کئی برسوں کے دوران ان احکامات پر عملدرآمد کئی بار روکا گیا اور اس کی بنیاد یہی بتائی گئی تھی کہ شفقت حسین کا مقدمہ اور اس کو دی جانے والی سزا دونوں ہی غیر قانونی تھے۔ اس دوران یہ الزامات بھی سامنے آئے کہ شفقت کا مقدمہ اور سزا اس لئے غیر قانونی تھے کہ وہ نوعمر تھا اور اس پر تشدد کر کے اس سے اقبال جُرم کروایا گیا تھا۔ 5 جنوری 2015ء کو وزیر داخلہ چودھری نثار نے شفقت حسین کی سزا پر عملدرآمد رکوا دیا تھا۔ سزا پر عملدرآمد اگلے ہفتے ہونا تھا۔ چوہدری نثار علی نے سول سوسائٹی اور شفقت کے وکلاء کی طرف سے شفقت کی عمر کے حوالے سے مہیا کی جانے والی اطلاع پر سزا پر عملدرآمد رکوایا تھا اور اس معاملے کی تحقیقات کروانے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اگلے دو ماہ کے دوران کوئی تحقیقات نہ کروائی گئیں اور شفقت کو 19 مارچ کو پھانسی دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے احتجاج کے نتیجے میں پھانسی لگنے سے صرف چند گھنٹے پہلے سزا پر عملدرآمد ایک بار پھر روک دیا گیا۔ اور وزارت داخلہ نے وفاقی تحقیقاتی ادارہ (ایف آئی اے) کے افسران پر مشتمل ایک تحقیقاتی ٹیم قائم کی جس نے 20 اپریل کو اعلان کیا کہ اس نے مقدمہ کے ریکارڈ پر جو تحقیقات کی ہیں وہ مکمل ہوگئی ہیں جن کے مطابق شفقت حسین ارتکاب جرم کے وقت نوعمر نہیں تھا۔ پاکستان کی سول سوسائٹی نے تحقیقاتی ٹیم کے تحقیقاتی نتائج پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کی مذمت کی اور ایف آئی اے کو پاکستان کا ایک ایسا ادارہ قرار دیا جو شفاف اور آزادانہ طور پر تحقیقات کرنے کی اہلیت سے عاری ہے۔

زہرہ یوسف نے مزید کہا کہ پاکستان نے موت کی سزاؤں پر سات سالہ عارضی معطّلی کو دسمبر 2014ء میں ختم کر دیا تھا۔ اور تب سے اب تک تقریباً دو سو افراد کو پھانسیاں دی جا چکی ہیں۔ ان میں نوعمر مجرم بھی شامل ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ پاکستان شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدے اور بچوں کے حقوق سے متعلق کنونشن، دونوں معاہدوں پر دستخط کر کے ان کی توثیق کر چکا ہے جس کے تحت اٹھارہ برس سے کم عمر کے افراد کی طرف سے ہونے والے جرائم پر انہیں موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ پاکستان جی ایس پی پلس کے تحت یورپی یونین کے ساتھ ترجیحی تجارت کے فوائد حاصل کر رہا ہے جس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ متعلقہ ملک ان معاہدوں پر عملدرآمد کرے۔

انسانی حقوق کے بین الاقوامی وفاق کے صدر کریم لاہجی نے واضح کیا ہے کہ ''یورپی یونین کسی صورت انسانی حقوق کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔ پاکستان کو یہ دکھانے کے لئے ٹھوس قدم اٹھانا پڑے گا کہ پاکستان میں نوعمر مجرم کو پھانسی نہیں دی جاتی اور پاکستان میں مقدمہ کی منصفانہ سماعت کے حق سے انکار نہیں کیا جاتا''۔

20 جولائی 2015ء کو پاکستان کے حوالے سے اپنے اختتامی استدلال کو یورپی یونین کی کونسل نے دوہرایا ہے کہ مقدمے کی منصفانہ سماعت اور نوعمر مجرموں کے لئے سزائے موت پر پابندی جی ایس پی پلس سکیم کی بنیادی ضرورت ہیں۔ جی ایس پی پلس سکیم کے تحت پاکستان کو ترجیحی تجارت کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چونکہ پاکستان واضح طور پر ان ضروریات کو پوری نہیں کر رہا، اس لیے ہماری تنظیمیں یورپی یونین سے مطالبہ کرتی ہیں کہ یورپی یونین جی ایس پی ریگولیشن کی شق 15 میں دیئے گئے طریق کار کا آغاز کرے جس کے باعث پاکستان ان مراعات کو کھو سکتا ہے۔ ہماری تنظیمیں حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ پھانسیوں کو فوری طور پر روکے، خاص طور پر نوعمر مجرموں کی پھانسیوں پر عملدرآمد کو فوری طور پر روکے اور پہلے قدم کے طور پر پھانسی کی سزاؤں پر عارضی معطّلی کو فوری طور پر بحال کرے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 05 اگست 2015]

بچوں پر ہونے والے جنسی تشدد کی فوری تحقیقات کا مطالبہ

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے قصور میں بچوں کے حوالے سے سامنے آنے والے جنسی سکینڈل پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اس معاملے کی تحقیقات کے عمل کو تیز کیا جائے اور بچوں کو جنسی تشدد سے تحفظ دینے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں۔

پیر کے روز جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''قصور میں سامنے آنے والے بچوں کے جنسی سکینڈل کے ہولناک واقعہ نے کمیشن کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ میں جنسی تشدد کا شکار ہونے والے بچوں کی تعداد کے حوالے سے کوئی ابہام ہو، وقوعہ کے وقت کے حوالے سے بھی ابہام ہوسکتا ہے، یہ امکان بھی ہوسکتا ہے کہ زمین کا تنازعہ اس واقعہ کے ساتھ منسلک ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس واقعہ نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی ہے کہ کئی بچوں کو جنسی تشدد کا شکار بنانے کے علاوہ ان کے ساتھ ہونے والے جنسی عمل کی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔

مجرمانہ مقدمات میں عدالتی کمشنوں کے قیام اور تحقیقات سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ان بچوں کی حالت کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ فوری اور پیشہ وارانہ سطح پر تحقیقات کروائی جائیں اور اس میں کسی بھی طرف سے مداخلت نہیں ہونی چاہئے۔ اس حوالے سے خبروں اور اطلاعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے احتراز کیا جانا چاہئے اور نہ ہی ان پر اور استغاثہ پر اثر انداز ہونا چاہئے۔ اور اگر ایسی کوئی حرکت کسی بھی جانب سے ہوتی ہے تو اس کی مذمت کرنے کے علاوہ اس کی تحقیقات کرنی چاہئے۔

کمیشن نے کہا کہ کوئی نہیں جانتا کہ اور کتنے دیہات میں ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ اگر ایسے واقعات کو فوری طور پر روکا نہ گیا تو بچوں کے خلاف جنسی تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوگا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس حوالے سے فوری اقدامات کئے جائیں تاکہ ان خوفناک واقعات میں اضافے کو روکا جاسکے۔ اس واقعہ نے اس حقیقت کی طرف توجہ بھی مبذول کروادی ہے کہ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے عمل کی تیار کی گئی ویڈیو فلمیں حاصل کر کے انہیں ضائع کیا جانا چاہئے اور اس کاروبار سے منسلک افراد کو قرار واقعی سزائیں دلوائی جائیں۔

اس واقعہ سے یہ ضرورت بھی سامنے آئی ہے کہ حکام بچوں کے حقوق سے متعلق قائم کمیٹی کی اُن سفارشات پر عملدرآمد کریں جن پر پاکستان 2012ء میں رضامندی کا اظہار کر چکا ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے اپنے طور پر اس واقعہ کی تحقیقات کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کی تکمیل کے بعد کمیشن اس واقعہ کے حوالے سے اپنا تفصیلی موقف پیش کرے گا۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 10 اگست 2015]

وفاقی اور پنجاب حکومتیں دہشت گردی سے متعلق حکمت عملی کا ازسرنو جائزہ لیں

اٹک میں گزشتہ روز ہونے والے دہشت گردی کے حملہ میں جاں بحق ہونے والے افراد کے خاندانوں سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے وفاقی اور پنجاب حکومتوں سے کہا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف اپنی حکمت عملی کا ازسرنو جائزہ لیں۔ آج جاری ہونے والے اپنے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق 19 انتہائی قیمتی انسانی جانوں کے نقصان پر عوام کے صدمے میں برابر کا شریک ہے۔ یہ انسانی جانیں خودکش بم دھماکے کے نتیجے میں ہوئیں جو پنجاب کے وزیر داخلہ کرنل (ریٹائرڈ) خانزادہ شجاع کے گھر کے بیرونی حصے میں کیا گیا۔ کمیشن سوگوار خاندانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ کمیشن کو اس واقعہ پر اس لئے بھی زیادہ دکھ ہوا ہے کہ دو روز قبل قوم کو یہ خوشخبری سنائی گئی تھی کہ ہماری فوج کو دہشت گردی کی کمر توڑنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

''اس ہولناک واقعے نے انسداد دہشت گردی کی حکمت عملی اور اس کے نفاذ سے متعلق کئی اہم سوالات کو جنم دیا ہے۔ پنجاب حکومت سیکورٹی میں پائی جانے والی خامیوں کی ذمہ داری لینے سے انکار نہیں کر سکتی جس کے نتیجے میں کئی انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ کرنل شجاع خانزادہ کو کئی دنوں سے دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن اس کے باوجود اتوار کے روز انہیں سکیورٹی فراہم نہ کی گئی۔ حتیٰ کہ اُن سے وابستہ ایلیٹ پولیس سکواڈ بھی غیر حاضر تھا اور بظاہر اجلاس کے مقام تک رسائی کی نگرانی نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک کسی بھی

لاہور، 12 اگست: پاکستان میں تعینات ہندوستانی ہائی کمشنر نے ایچ آر سی پی کے سیکرٹریٹ میں پاکستان اور ہندوستان کے مابین پرامن تعلقات کے موضوع پر خطاب کیا

گروپ نے حملے کی ذمہ داری قبول نہیں کی تاہم اس واقعے میں حالیہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے ملک اسحاق کے گروہ کے ملوث ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی حکومت پنجاب میں دہشت گرد گروہوں کی موجودگی کے بارے میں مطمئن ہونے کی متحمل ہو سکتی ہے۔ حکومت کو انسداد دہشت گردی سے متعلق اقدامات پر بھی نظر ثانی کرنی چاہئے۔ اس کے تمام اقدامات قانون کے مطابق ہونے چاہئیں کیونکہ اس اصول سے انحراف کی صورت میں حکومتی قائدین اور اہلکاروں کے لئے خطرہ بڑھ جائے گا اور اس سے قومی ایکشن پلان کی کامیابی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوگا۔ اس کے علاوہ سکیورٹی فورسز پر عوام کے اعتماد کو بحال کرنے کے راستے بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 17 اگست 2015]

جبری گمشدگیوں سے متعلق اقوام متحدہ کے معاہدے کی توثیق کی جائے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے حکومت سے جبری و غیر ارادی گمشدگیوں سے متعلق اقوام متحدہ کے معاہدے کی فوری طور پر توثیق کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیشن نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ جبری گمشدگیوں میں ملوث عناصر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے کیونکہ ابھی تک اس حوالے سے کسی ایک فرد کے خلاف بھی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔

جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے عالمی دن کے موقع پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا:

''حکومت کو جبری گمشدگیوں کو مجرمانہ فعل قرار دینا چاہئے۔ پاکستان میں لاپتہ افراد کے حوالے سے صورتحال منفرد ہے کیونکہ پاکستان نے دو الگ قوانین کا نفاذ کیا ہے جو جبری گمشدگیوں کے عمل کو قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ پاکستان تحفظ ایکٹ 2014ء کے تحت، معقول شبہ کی بنیاد پر کسی فرد کو بغیر کسی وارنٹ کے 90 روز کے لیے آزادی سے محروم کرنا قانونی اقدام ہے۔ اسی طرح، ''ایکشن ان ایڈ آف سول پاور ریگولیشن 2011''، کے تحت مسلح افواج کے اقدامات اور کارروائیوں کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ یہ قوانین پاکستان کے آئین کی دفعات اور انسانی حقوق کے عالمی منشور (یو ڈی ایچ آر) سے متصادم ہیں اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والے مجرموں کو استثنیٰ فراہم کرتے ہیں۔

مشاورت کا اہتمام جبری گمشدہ افراد کے عالمی دن کے موقع پر ہوا تھا اور مشاورت کے بعد پرامن احتجاجی مظاہرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ انسانی حقوق کے کارکنوں، قانونی ماہرین، ذرائع ابلاغ سے منسلک افراد، سول سوسائٹی کی تنظیموں کے اراکین اور بلوچستان، کے پی اور سندھ سے لاپتہ افراد کے اہل خانہ مشاورت میں شریک تھے۔

ایچ آر سی پی نے رواں برس کے اوائل میں سندھ کے متاثرہ خاندانوں کے انٹرویوز کئے تھے جنہیں مشاورت کے دوران پیش کیا گیا۔ تقریب میں شریک خاندانوں نے دیگر شرکاء کو اپنی داستانیں سنائیں اور اس کے بعد سول سوسائٹی کی تنظیموں کی جانب سے کھلے مباحثے کا اہتمام کیا گیا۔

انسانی حقوق کی کارکن اور ڈیفنس فار ہیومن رائٹس، کی چیئرپرسن آمنہ مسعود جنجوعہ اس معاملے میں حکومت کی عدم دلچسپی پر تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ تمام مرکزی فریقین کو اکٹھا ہو کر اس مسئلے پر مذاکرے کا اہتمام کرنا چاہئے اور مزید کہا کہ سیاسی عمل ہی اس مسئلے کا مناسب حل ہے۔

سول سوسائٹی کی تنظیموں کے قائدین کا کہنا تھا کہ اگر اس سنگین جرم کی روک تھام نہ کی گئی تو مستقبل میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سابق چیئرپرسن اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی سابق صدر، عاصمہ جہانگیر نے کہا ''یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ ریاستی ادارے بشمول موجودہ حکومت انسانی حقوق کی اس خلاف ورزی کو سنجیدہ نہیں لے رہے۔ مشاورت میں موجود متاثرین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جرم میں ملوث ریاستی عناصر کو اپنے خلاف قانونی کارروائی کے فقدان کے باعث شہہ ملی ہے''۔ [پریس ریلیز۔ لاہور۔ 30 اگست 2015]

طبی سہولیات کے فقدان پر تشویش کا اظہار

ایچ آر سی پی اسپیشل ٹاسک فورس تربت مکران کے اگست 2015 کا ماہانہ اجلاس اتوار، 9اگست2015 کو اس کے اپنے دفتر واقع تربت میں منعقد ہوا جس میں 21 سرگرم ساتھیوں نے شرکت کی۔ حاضری، رجسٹریشن، تعارف، ابتدائی کلمات اور رپورٹوں کے بعد،''مکران میں صحت کی صورتحال'' کے خصوصی موضوع پر باری باری تمام شرکاء نے اظہار خیال کیا۔ اور سب نے اتفاق رائے سے بتایا کہ فلسفہ وجودیت کے مطابق وجود کی اہمیت جوہر یعنی مقصد، نظریہ، یا عقیدہ وغیرہ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ وجود پہلے پیدا ہوتا ہے، اور جوہر بعد میں وجود کی ضروریات کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ، یا خالی پنجرہ ہو، جس میں طرح طرح کے موذی امراض نے اپنا مسکن بنالیا ہو، تو پھر اس قسم کا وجود جوہر سے بھلا کیا کام لے سکے گا اور اس سے کونسا فائدہ اُٹھا سکے گا؟ جب کسی علاقے میں بھوک، غربت اور بے روزگاری کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے موذی امراض کے حملے ہوں، اور ان کے سدباب کے لئے کچھ بھی نہ ہو، اور حتیٰ کہ ہسپتالوں میں علاج معالجے کے انتظامات بھی نہ ہونے کے برابر ہوں، تو پھر لوگ ہڈیوں کے ڈھانچے، یا خالی پنجرے نہیں بنیں گے تو پھر بھلا کیا بنیں گے؟ سب کا کہنا یہی تھا کہ مکران کے دیہی علاقوں کی ڈسپنسریوں بیسک ہیلتھ یونٹوں اور رورل ہیلتھ سینٹروں میں تو علاج معالجے سے متعلق حالات اور زیادہ خراب ہیں، لیکن تربت، پنجگان اور گوادر کے سرکاری ہسپتالوں میں بھی علاج معالجے سے متعلق حالات ناگفتہ بہہ ہیں۔ جہاں امراض قلب، امراض چشم، امراضِ گردہ، امراض نسواں، پروسٹیٹ کے مسائل، ہاتھ، پیر، پیٹھ، کمر، گردن اور جوڑوں کے درد، نفسیاتی مسائل، ایپیلپٹائٹس کی مختلف اقسام، ڈلیوری اور زچہ بچہ کے مسائل اور دیگر امراض کے معائنے، نگہداشت، علاج معالجے اور آپریشنوں کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ شرکاء کا کہنا تھا کہ مکران کے صدر مقام تربت کے ڈی ایچ کیو ہسپتال کے کل ڈاکٹر 87 ہیں، جن میں سے محض 17 سے لیکر 21 ڈاکٹر اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے ہیں۔ ماہر ڈاکٹروں اور سرجنوں کی کمی ہے۔ ماہر ڈاکٹر اور سرجن رہائش اور دیگر سہولیات کے فقدان کی وجہ سے یہاں آنے اور کام کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس وقت 2 یا 3 وارڈ بند ہیں۔ ادویات صرف امیروں کو دی جاتی ہیں، غریبوں کو نہیں۔ اور بعض اوقات ادویات اسٹوروں میں پڑی رہتی ہیں، اور ایکسپائر ہوجاتی ہیں، جنہیں بعد میں جلا دیا جاتا ہے۔ ہسپتال کے وارڈوں میں داخل ہونے والے غریب مریضوں کو اپنے لئے ادویات، سرنج اور دیگر ضروری اشیاء او رحتیٰ کہ ڈاکٹروں کے دستانے بھی میڈیکل اسٹوروں سے خریدنے پڑتے ہیں۔ غریب مریض ادویات خرید بھی نہیں سکتے، بلکہ وہ سستی سے سستی ادویات خریدنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ یہاں لیبز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور مختلف ضروری آلات اور مشینیں بھی نہیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب تمپ، مند، دشت، بلیدہ، ہوشاپ، سامی، شہرک، ڈنڈار، گوادر اور پنجگور سمیت دور دراز علاقوں سے بیمار آتے ہیں، تو یہاں ہسپتال میں ڈاکٹر موجود نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ ایمرجنسی وارڈ میں بھی کوئی ڈیوٹی ڈاکٹر موجود نہیں ہوتے۔ جس سے بیمار اور ان کے ساتھ آنے والے غریب عزیز و اقارب کو کافی دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مریضوں کو اکثر امراض کی مزید شدت یا اموات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمام شرکاء اس بات پر بھی متفق تھے کہ محکمہ تعلیم اور دیگر شعبوں کی طرح محکمہ صحت بھی بالکل تباہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اور کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔ تاہم بعض شرکاء کا کہنا تھا کہ ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین اور میونسپل کار پوریشن کے میئر سے اپیل کی جائے کہ وہ مکران ڈویژن کے ہسپتالوں، یا کم از کم ڈی ایچ کیو ہسپتال تربت کے صحت کے معاملات میں مداخلت کرکے ان کے حالات بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ پھر متفقہ طور پر ڈی ایچ کیو ہسپتال تربت کے دورے کا فیصلہ کیا گیا، اور اس مقصد کے لئے ایک ٹیم بھی تشکیل دی گئی۔ اور آخر میں 4 قراردادیں پیش کی گئیں، جنہیں اتفاق رائے سے منظور کیا گیا، جو یہ ہیں:۔

ہسپتال کے وارڈوں میں داخل ہونے والے غریب مریضوں کو اپنے لئے ادویات، سرنج اور دیگر ضروری اشیاء اور حتیٰ کہ ڈاکٹروں کے دستانے بھی میڈیکل اسٹوروں سے خریدنے پڑتے ہیں۔ غریب مریض ادویات خرید بھی نہیں سکتے، بلکہ وہ سستی سے سستی ادویات خریدنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

اگست 2015 کے ماہانہ اجلاس کی قراردادیں

1۔ مکران کے ہسپتالوں میں صحت کے مناسب انتظامات کئے جائیں

مکران بلوچستان کا ایک اہم ترین علاقہ اور ڈویژن ہے۔ لیکن یہاں کے ہسپتالوں میں علاج معالجے کے مناسب انتظامات نہیں ہیں تربت جو مکران ڈویژن کا صدر مقام ہے، یہاں کے ڈی ایچ کیو ہسپتال میں بھی علاج معالجے کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ امراض قلب، امراض چشم، امراض گردہ، امراض نسواں، نفسیاتی امراض، جوڑوں کے درد، ہیپاٹائٹس کی مختلف اقسام، پروسٹریٹ کے مسائل، وضع حمل کے پیچیدہ مسائل، اور دیگر بیماریوں کے مناسب ٹیسٹ، علاج معالجہ اور آپریشنوں کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ جس سے چھوٹے موٹے امراض کے علاج معالجہ، ٹیسٹوں، اور آپریشنوں کے لئے بھی کراچی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ تاہم غریب، نادار اور بے روزگار لوگوں کے لئے نہ تو کراچی کی آمد و رفت ممکن ہے اور نہ ہی علاج معالجہ، ٹسٹ اور آپریشن وغیرہ۔ لہذا یہ اجلاس بلوچستان کی صوبائی حکومت، بلوچستان کے محکمہ صحت، پاکستان کی وفاقی حکومت، وفاقی محکمہ صحت اور دیگر متعلقہ شعبوں، حکام اور افسران سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ عموماً تمام مکران ڈویژن کے ہسپتالوں میں اور خصوصاً تربت، پنجگان اور گوادر کے ہسپتالوں میں صحت کے تمام شعبوں، ماہر ڈاکٹروں، عام ڈاکٹروں، ٹیسٹوں، آپریشنوں، لیبز، ضروری آلات اور مشینوں اور پورے علاج معالجے کے مناسب انتظامات کروائے جائیں۔

2۔ آواران کا محاصرہ، زمینی آپریشن اور فضائی بمباری کا سلسلہ بند کیا جائے

عموماً ضلع آواران کے علاقہ مشکے میں 30 جون 2015 سے اور خصوصاً ضلع آواران کے دوسرے علاقوں میں 17 جولائی 2015 سے ایف سی کا محاصرہ، زمینی آپریشن اور فضائی بمباری کا سلسلہ جاری ہے جس میں جیٹ اور گن شپ ہیلی کوپٹروں کا استعمال بھی ہورہا ہے۔ آخری اطلاعات کے مطابق اب تک 200 سے زیادہ لوگوں کو جبری طور پر اغوا کرکے اپنی تحویل میں لاپتہ کیا جاچکا ہے۔ 1000 سے زیادہ لوگوں کو ہلاک کرکے ان کی مسخ شدہ لاشوں کو پھینک دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بالگتر کا فوجی محاصرہ ختم کرنے اور بلوچستان کے عوام کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

(رپورٹ، غنی پرواز، 9اگست 2015)

بچوں کے حقوق سے چشم پوشی

آئی۔اے۔رحمان

حکومت پاکستان کی جانب سے اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی (یو این سی آر سی) کو جمع کرائی گئی تازہ ترین رپورٹ ملک کے بچوں کے لئے خاطر خواہ اقدامات نہ کرنے سے متعلق ایک قابل افسوس اظہار معذرت ہے۔

حکومت ہر چار سال کے بعد یو این سی آر سی کو ایک رپورٹ جمع کرانے کی پابند ہے جس میں اسے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس نے بچوں کے حقوق کے میثاق (سی آر سی)، بالخصوص حکومت کی ابتدائی رپورٹوں سے متعلق کمیٹی کی سفارشات پر عملدرآمد کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں۔

یہ کمیٹی کو جمع کرائی گئی پانچویں سلسلہ وار رپورٹ ہے۔ یہ رپورٹ 2013ء میں تیار کی گئی تھی اور اقوام متحدہ کی کمیٹی اکتوبر میں اس کا جائزہ لے گی۔ یہ رپورٹ جنوری 2008ء سے مارچ 2013ء تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔

اور اس رپورٹ کا تقریباً تمام تر مقصد کمیٹی کی جانب سے 2009ء میں کئے گئے مطالبات پر پورا اترنا ہے۔

اس رپورٹ کے بارے میں دو نقاط پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلا یہ کہ یہ رپورٹ دسمبر 2011ء میں جمع کرائی جانی تھی اور اسے جمع کرانے میں جو تاخیر ہوئی وہ معمول سے کافی کم ہے۔ دوسرا یہ کہ رپورٹ کے لئے مقرر کی گئی 120 صفحات کی حد کے برخلاف اس رپورٹ کے صفحات کی تعداد 85 سے زیادہ نہیں ہے، باوجود اس کے کہ اس کے متن کے لئے بڑا فانٹ استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم کمیٹی نے ملک کے بارے میں بنیادی معلومات پر مشتمل ایک جامع دستاویز جمع کرانے کی جو درخواست کی تھی اسے ایک مرتبہ پھر نظرانداز کیا گیا۔

یہ رپورٹ حسب معمول چند انکشافات پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل پیراگراف پر ایک نظر ڈالیے:

''سی آر سی کی مطابقت میں بچوں کے حقوق کی مکمل تکمیل کے لئے کثیر وسائل درکار ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکومت نے 2013ء کو بچوں کے حقوق کا سال قرار دیا تھا جس میں معاشرے میں آگہی پیدا کرنے کے لئے آگہی میں اضافہ کرنے والے جامع پروگرام منعقد کئے جانے تھے۔ حکومت نے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے 2013ء میں ایک کمشنر بھی مقرر کیا تھا۔''

سوچنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے نمائندے کمیٹی کو اس مہم کے بارے میں کیا جواب دیں گے جو انہوں نے 2013ء کے لئے طے کی تھی!

بچوں کے استحصال اور جنسی زیادتی کا معاملہ، جو قصور کے سکینڈل کے بعد عوام بحث کا مرکز بن چکا ہے، 2009ء میں کمیٹی کے اختتامی کلمات میں اس کا نمایاں طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ کمیٹی نے تجویز دی تھی کہ ایک ایسا قانون منظور کیا جائے جس میں جنسی زیادتی کے جرم کی تشریح کی جائے، جو شہری اور دیہی آبادیوں کا احاطہ کرتا ہو، اور؛ ''کمیٹی یہ تجویز بھی دیتی ہے کہ جنسی زیادتی سمیت بچوں سے زیادتی کے مقدمات کی مناسب طور پر تحقیقات کی جائیں اور مجرموں کے خلاف باضابطہ قانونی کارروائی کی جائے۔ اور اس حوالے سے صنفی حساسیت کو مدنظر رکھا جائے۔

حکومت کا ردعمل کافی دلچسپ ہے: ''اگرچہ جنسی استحصال اور زیادتی کی تمام شکلیں پاکستان میں ایک سنگین جرم ہے تاہم قوانین اور ان پر عملدرآمد کو بہتر بنانے کے لئے کافی گنجائش ہے۔ اس حوالے سے سول سوسائٹی کی کچھ تنظیموں نے بچوں سے جنسی زیادتی اور استحصال کی وسعت، دائرہ کار اور بنیادی وجوہات کے بارے میں آگہی فراہم کرنے کے لئے جائزوں کا انعقاد کیا۔ حکومت اور

حکومت ہر چار سال کے بعد یو این سی آر سی کو ایک رپورٹ جمع کرانے کی پابند ہے جس میں اسے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس نے بچوں کے حقوق کے میثاق (سی آر سی)، بالخصوص حکومت کی ابتدائی رپورٹوں سے متعلق کمیٹی کی سفارشات پر عملدرآمد کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں۔

سول سوسائٹی کی تنظیمیں عدالتوں میں متاثرہ بچوں اور خاندانوں کے مقدمات کی پیروی کرتے وقت مشترکہ طور پر ان کی مدد کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے پولیس اور عدلیہ کے افسران کے لئے متعدد مشاورتی اجلاس بھی منعقد کئے ہیں۔

2012ء میں بچوں کے حقوق کے لئے قومی کمیشن (این سی ایچ آر) ایکٹ کی منظوری کا ذکر کر حکومت کے ان اقدامات میں سے ایک کے طور پر کیا جاتا ہے جو اس نے بچوں کے استحکام کے لئے کئے ہیں۔ وہ اس بات کا کیا عذر پیش کریں گے کہ 2015ء کے وسط تک بھی این سی ایچ آر کو فعال نہیں بنایا جا سکا؟ کہا یہ جاتا ہے کہ ان قوانین کی منظوری کا مقصد بچوں کے تحفظ میں اضافہ کرنا ہے تاہم اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا کہ ان سے کیا نتائج حاصل ہوئے۔

کمیٹی نے مسلح تنازعات میں بچوں کے استعمال کو روکنے کے بارے میں چند واضح سفارشات پیش کی تھیں۔ یہ رپورٹ کہتی ہے کہ اصل مسئلہ ''انتہا پسندوں کے ہاتھوں بچوں کا استعمال'' ہے۔ اس رپورٹ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے قانون کے نفاذ کے لئے جو آپریشن کر رہے ہیں اسے تصادم کی صورتحال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حکومت دہشت گرد اور انتہا پسند گروہوں کے ہاتھوں بچوں کے استعمال کو روکنے کے لئے حد درجہ اقدامات کر رہی ہے۔ ان تمام لوگوں کے خلاف تعزیری کارروائی کی جا رہی ہے جو دہشت گردی کی کارروائیوں میں بچوں کو استعمال کرتے ہیں۔'' اس معاملے پر سی آر سی کے معاہدے کی توثیق نہ کرنے کی کوئی وضاحت پیش نہیں کی جاتی۔ حتیٰ کہ اس معاہدے کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔

کمیٹی نے مدارس کو باضابطہ بنانے، مذہبی یا فرقہ وارانہ عدم رواداری کی تعلیم کے خاتمے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے، اور مسلح مدرسوں میں بچوں کو ناروا سلوک سے تحفظ فراہم کرنے، اور مسلح گروہوں کی جانب سے طلباء کی بھرتی کو روکنے کا مطالبہ کیا تھا۔ حکومت کہتی ہے کہ: ''پاکستان میں مدارس کے اندراج میں بہتری آئی ہے۔۔۔ وفاقی حکومت نے ان اداروں کی بہتری اور نگرانی کو ترجیح دی ہے'' اور وہ حیران کن طور پر مدارس کا دفاع کرتی دکھائی دیتی ہے۔

''تاہم مدارس کی موثر نگرانی کے لئے مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جو تعداد میں کافی زیادہ ہیں اور دیہی اور دور دراز کے علاقوں سمیت ملک کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ مدرسوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی جڑیں معاشرے اور ثقافت میں بہت گہری ہیں کیونکہ وہ کمیونٹی کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور انہیں کمیونٹی کی حمایت اور شراکت حاصل ہے؛ والدین اور عمائدین مدارس کا بہت احترام کرتے ہیں۔ تاہم حکومت اپنے مدارس اور مدرسے کی تعلیم میں اصلاح کے پروگرام کو جاری رکھے گی۔''

اس کالم میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس میں مسودہ نویسی کے تمام جواہر، اچھی کارکردگی نہ دکھانے کی معذرتوں، سوالات سے گریز اور سفید جھوٹ کے استعمال کا نوٹس لیا جا سکے۔ اسلام آباد کے ایک حالیہ سیمینار میں 29 سفارشات پر مشتمل ایک مسودہ پیش کیا گیا۔ یہ شفارشات 2005ء میں تیار کی گئی تھیں اور انہیں 2009ء میں دہرایا گیا تھا، جن میں سے 12 پر ابھی تک عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ بچوں کے حقوق سے حد درجہ لاتعلقی کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی کو پیش کی گئیں رپورٹیں ملک کے مستقبل میں حکومتی سرمایہ کاری کی سطح کو جانچنے کا آلہ ہو سکتی ہیں۔ ایک اور اہم آلہ وہ عہدوپیماں ہیں جو پاکستان نے 2012ء میں عالمی سلسلہ وار جائزے کے دوران کئے تھے۔ ان میں سے بہت سے وعدے اب تک پورے نہیں کئے جا سکے۔

شاید اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت پاکستان اس بات کا احساس کرے کہ بچوں کے حقوق کے احترام کو یقینی بنانے کے لئے ایک قومی منصوبہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے شروع کئے گئے قومی ایکشن پلان سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس جتنا ہی اہم ہے۔ دہشت گردوں کے خاتمے سے بچے خود بخود خواندہ اور باشعور نہیں ہو جائیں گے، لیکن نوجوانوں کی مناسب تعلیم سے یقینی طور پر قوم کی دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی اہلیت، اور شاید زیادہ موثر طریقے سے مقابلہ کرنے کی اہلیت میں اضافہ ہوگا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

انتخابی افراتفری

آئی۔اے۔رحمان

ووٹ ڈالنے کے عمل میں دھاندلی کے خلاف اقدامات پر مناسب توجہ نہیں دی گئی

انتخابی ٹربیونلز نے اب تک جو فیصلے سنائے ہیں اور ان فیصلوں سے جس بحث مباحثہ نے جنم لیا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انتخابات کو منصفانہ اور صاف شفاف بنانے کے لئے جو حفاظتی اقدامات کئے گئے ہیں، ان پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ یہ اقدامات درج ذیل ہیں:۔

☆ ووٹروں کی انگلی پر انمٹ سیاہی کا استعمال

☆ بیلٹ پیپرز کے دوسرے حصے، جو انتخابی عملہ اپنے پاس رکھتا ہے (کاؤنٹر فوائل) پر ووٹروں کے انگوٹھوں کے نشان لگوانا،

☆ پولنگ سٹیشنوں کے اندر کنوینگ اور غیر متعلقہ افراد کی موجودگی پر پابندی،

☆ شمار کردہ ووٹوں کی تفصیل تیار کرنا، (فارم 14 کی تیاری)

☆ بیلٹ پیپر اکاؤنٹ کی تفصیل (فارم 15 تیار کرنا)،

یہ کام پریذائیڈنگ افسروں کا ہے۔ اس کے علاوہ پولنگ سٹاف اور ریٹرننگ افسروں پر الیکشن کمیشن کا نہ صرف موثر کنٹرول ہونا ضروری ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتظامی امور پر بھی مکمل کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں انتخابی عمل سے جڑے ہوئے حفاظتی اقدامات کو دیکھنا بھی الیکشن کمیشن کے فرائض میں شامل ہے۔

ملک بھر میں عمومی طور پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ ان حفاظتی اقدامات سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ اقدامات ان پولنگ حکام اور ایسے لوگوں کو سامنے رکھتے ہوئے تیار کئے گئے تھے جن کی ذہانت کی سطح پاکستان کے موجودہ انتخابی عملہ کی ذہانت سے کہیں زیادہ ہے۔ آیئے ہم ایک ایک کر کے بات کرتے ہیں۔

2013ء کے انتخابات کے حوالے سے ملنے والی شکایات میں کہا گیا تھا کہ زیادہ تر پولنگ سٹیشنوں پر انمٹ سیاہی استعمال نہیں کی گئی تھی۔ بعض جگہوں پر پولنگ عملہ نے کہا کہ انہیں انمٹ سیاہی مہیا ہی نہیں کی گئی۔ اور یہ کہ انہیں مارکیٹ سے عام سیاہی خریدنا پڑی۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ شکایات الیکشن کمیشن آف پاکستان کو پہنچائی گئیں یا نہیں اور اگر یہ شکایات پہنچیں تو کیا پولنگ کے دوران ان شکایات کا تدارک کیا گیا یا ووٹروں کے صحیح ہونے کی تصدیق کے لئے بیلٹ پیپروں کے کاؤنٹر فوائلز پر ووٹروں کے انگوٹھوں کے نشانوں پر انحصار کیا گیا۔ اس سے دو مسئلے سامنے آئے۔ یہ ضمانت دینا ممکن نہیں تھا کہ نادرا کے پاس تمام ووٹروں کے انگوٹھوں کے نشان بالکل صحیح ہیں۔ یا پولنگ کے وقت پریذائیڈنگ افسر انگوٹھوں کے نشان صحیح طور پر لے بھی سکے تھے یا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیلٹ پیپروں پر انگوٹھوں کے نشانات نادرا کے ریکارڈ پر موجود انگوٹھوں کے نشانات سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دونوں طرف انگوٹھوں کے صحیح نشانات لینے کی ضرورت تھی جو ممکن نہیں تھا۔

مزید برآں نادرا ریکارڈ میں موجودہ انگوٹھوں کے نشانات کے ساتھ انگوٹھوں کے نشانات کی تصدیق پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کا واضح مطلب یہی ہے کہ صرف بہت امیر فرد ہی یہ کام کروا سکتا ہے اور تصدیق کا یہ کام عام آدمی کے بس کا نہیں ہے۔ بڑے پیمانے پر تصدیق کا یہ طریقہ اختیار نہ کرنے کے باعث اس طریقِ کار کی ناکامی سامنے آ گئی۔

پولنگ سٹیشنوں پر ڈسپلن کی کمی کی شکایات کثیر تعداد میں تھیں۔ پولنگ سٹیشنوں کے اندر کھلے عام کنوینگ دیکھنے میں آئی اور امیدواروں کے مصاحبین جو عام طور پر مسلح ہوتے تھے آزادی کے ساتھ پولنگ سٹیشنوں کے اندر آ جا سکتے تھے اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ بہت سے مقامات خصوصاً دیہی علاقوں میں یہ صورتحال دیکھنے میں آئی۔ کئی پولنگ اسٹیشنوں پر ایسا ہوا کہ پریذائیڈنگ افسروں نے فارم 14 بھرے ہی نہیں (یہ وہ فارم ہوتا ہے جس میں شمار کردہ ووٹوں کی تعداد دی گئی ہوتی ہے)۔ اور نہ ہی فارم 15 بھرے (ووٹوں کا شمار) اس کے علاوہ بہت سے تھیلے صحیح طریقے سے سیل نہیں کئے گئے تھے یا انہیں صحیح

> یہ ضمانت دینا ممکن نہیں تھا کہ نادرا کے پاس تمام ووٹروں کے انگوٹھوں کے نشان بالکل صحیح ہیں۔ یا پولنگ کے وقت پریذائیڈنگ افسر انگوٹھوں کے نشان صحیح طور پر لے بھی سکے تھے یا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیلٹ پیپروں پر انگوٹھوں کے نشانات نادرا کے ریکارڈ پر موجود انگوٹھوں کے نشانات سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دونوں طرف انگوٹھوں کے صحیح نشانات لینے کی ضرورت تھی جو ممکن نہیں تھا۔

طور پر محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔

ان تمام مسائل نے شدت اختیار کر لی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن کمیشن کو پولنگ کے عملہ یعنی ریٹرننگ افسروں سے لے کر سیکورٹی پر مامور افراد پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ پولنگ سٹیشنوں پر جو کچھ ہو رہا تھا کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے پاس اس کو روکنے کی قوت نہیں تھی، اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں اس کی ناکامی تھی یا پھر اس کی وجہ یہ تھی کہ پولنگ کے عملہ خصوصاً ریٹرننگ افسروں کے طرز عمل پر نظر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اصولی طور پر جب ایک بار عام انتخاب علان ہو جائے تو الیکشن کمیشن ملک میں آزادانہ اور شفاف انتخابات کروانے کے لئے تمام انتظامی اداروں سے مدد حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی اختیارات حاصل کرتا ہے۔ تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ انتظامیہ سرکاری ملازمین کی تقرریوں اور ٹرانسفروں پر پابندی کا دھیان نہیں رکھتی اور نہ ہی الیکشن کمیشن آف پاکستان کے لئے ممکن ہے کہ وہ پولنگ کے عملہ کے طرز عمل کی نگرانی کر سکے۔

روائتی طور پر انتخابی حکام انتخابات کروانے کے لئے عدالتی افسروں پر انحصار کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ سیاسی تعصبات سے آزاد ہوتے ہیں اور یہ لوگ طاقتور امیدواروں اور اعلیٰ انتظامی افسروں کی طرف سے پڑنے والے دباؤ کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان مفروضوں پر انتہائی سنجیدہ سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستانی سماج اس حد تک تقسیم کا شکار ہے کہ کسی بھی سرکاری ملازم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ قطعی طور پر غیر جانبدار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی یونین کے مبصرین نے 2013ء کے انتخابات پر اپنی رپورٹ میں تجویز کیا تھا کہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے پاس بطور ریٹرننگ آفیسرز اپنا تربیت یافتہ عملہ ہونا چاہئے۔

اب تک آزمائے جانے والے حفاظتی اقدامات کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انتخابی دھاندلی کے فن کے خلاف لڑنے کے طریقوں پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ دھاندلی کے معمولی سے امکان پر اگر تمام نہیں تو زیادہ تر امیدوار پولنگ کے عمل کو اپنے حق میں کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ تمام انسدادی اقدامات کا مقصد محض یہ ہے کہ ناجائز کاموں پر سزائیں دی جائیں جو کہ قانون کے تحت موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی مقصد پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ انتخابی عذر داریوں پر فیصلے جلد کئے جائیں۔ موخر الذکر حکمت عملی کس حد تک کامیاب رہی، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2013ء کے عام انتخابات سے متعلق متعدد انتخابی عذر داریوں پر ابھی تک فیصلے ہونا باقی ہیں جبکہ انتخابات ہوئے ڈھائی سال گزر چکے ہیں۔

اب جبکہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کو بہت سی باتوں کا جواب دینا ہے، تو اس کی شکایت کہ متعلقہ قوانین میں تبدیلیوں کے لئے اس کی تجاویز جو اس نے 2013ء کے انتخابات سے قبل پیش کی تھیں، کو سیاسی اتھارٹی کی طرف سے درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا، کو سرسری طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کچھ معاملات ایسے ہیں جو اس وقت انتخابی اصلاحات کے لئے قائم پارلیمانی کمیٹی کے اجلاس میں زیر بحث ہیں۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کی صلاحیت، استعداد اور غیر جانبداری کے بارے میں کسی کے کچھ بھی خیالات ہوں، 2013ء کے انتخابات کی شفافیت کو درپیش چیلنج اسی طرح برقرار رہے گا اور یہ گورننس کے نظام اور سیاسی عمل کو متاثر کرتا رہے گا۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ اگر جوڈیشل کمیشن حکومت کو قومی اسمبلی کے سپیکر ایاز صادق کی رکنیت کے حوالے سے کچھ سہولیات مہیا کرتا ہے تو عمران خان کا دھرنوں پر بھروسہ بحال ہو جائے گا۔ جمہوری نظام کی صحت کے لئے اس قسم کے ختم نہ ہونے والے مقابلے اچھا شگون نہیں ہوں گے۔

حکومت کے پاس دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ 2013ء کے فیصلے پر چلا جائے اور ہر کیس میں اسی کو بنیاد بنایا جائے۔ یا پھر چھ ماہ یا آس پاس کی مدت میں انتخابی اصلاح کے عمل کو مکمل کر کے متنازعہ فیہ مسائل کو طے کیا جائے اور عام انتخابات کروانے کا اعلان اسمبلی کی مدت کے اختتام سے ایک سال قبل کر دیا جائے۔ دوسرا راستہ قانون پرستوں کے لئے پسندیدہ نہیں ہوگا لیکن وہ جو جمہوریت کو ایک نظام کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جس کا مطلب کچھ لو، کچھ دو ہوتا ہے تو انہیں اس میں یقینی طور پر کچھ خوبیاں ضرور نظر آئیں گی۔

(انگریزی سے ترجمہ۔ بشکریہ ڈان)

جبری گمشدہ افراد سے ہمدردی کا عالمی دن

ایچ آر سی پی نے جبری گمشدہ افراد اوران کے اہل خانہ کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر ملک بھر میں پرامن احتجاجی مظاہروں، سیمینارز اور ریلیوں کا انعقاد کیا

اسلام آباد سلیمان گوہر خان 21 برس کا ہونے والا ہے، وہ خیبر پختونخوا کے ضلع چارسدہ کے موضع شکور میں 2009ء میں اس وقت آیا جب سوات میں ''عافیت کا راستہ'' کے نام سے آپریشن شروع کیا گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری سکول میں پہنچا جہاں اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہاں آنے کے تین ماہ بعد 27 جولائی کو خفیہ ادارے کے اہلکاروں نے سلیمان کو گرفتار کرلیا۔ اس وقت سلیمان صرف پندرہ برس کا تھا۔ اس کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ تب سے اس کے خاندان والے اس کا اتہ پتہ معلوم کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں لیکن انہیں ابھی تک اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ بات سلیمان کے بھائی علی نے ''ڈان'' کو بتائی جو گزشتہ چھ برسوں سے اپنے بھائی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

علی نے بتایا کہ خفیہ اداروں نے اس کے بھائی کو بہت سے لوگوں کے سامنے اٹھایا، وہ سلیمان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے خاندان والوں سے رابطہ کرے چاہے وہ رابطہ ٹیلی فون ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ علی اپنی والدہ کے ہمراہ ایک سیمینار سے خطاب کررہا تھا جو گمشدہ افراد کی ان اداروں کے تسلط سے آزادی کے لئے مہم'' کے حوالے سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس سیمینار کا انعقاد پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے اتوار کو ''جبری گمشدگیوں کے عالمی دن'' کے حوالے سے کیا تھا۔

علی نے بات کرتے ہوئے کہا ''ہمارا سارا خاندان انتہائی تکلیف میں ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سلیمان زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ایجنسیاں سلیمان کو اجازت دیدیں کہ وہ گھر والوں سے ٹیلی فون پر رابطہ کرلے''۔ سیمینار میں دس خواتین پیش ہوئیں جو اس امید پر زندہ ہیں کہ ایک دن وہ اپنے پیاروں کو دیکھ سکیں گی۔ انہیں امید ہے کہ کوئی ان کی مدد کو آئے گا اور ان کے کھوئے ہوؤں سے ان کو ملوائے گا۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے سیکرٹری جنرل آئی۔اے۔رحمٰن نے ڈان کو بتایا کہ جبری گمشدہ افراد کا مسئلہ چند برس پہلے اٹھایا گیا تھا لیکن حکومتی اور غیر سرکاری اداروں (این جی اوز) کی اب اس معاملے میں دلچسپی ختم ہوچکی ہے۔ انہوں نے کہا ''جبری گمشدگی کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں یہ ثبوت موجود ہیں کہ یہ لوگ کیسے غائب ہوئے لیکن ثبوت ہونے کے باوجود ان افراد کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی''۔

بلوچستان نیشنل پارٹی (بی این پی) کے سینٹر جہانزیب جمالدینی نے کہا کہ جبری گمشدگیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان بدنام ہورہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''سینیٹرز تک اس معاملے سے بے خبر ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ گمشدہ افراد کے مسئلہ کو اٹھائیں''۔ جمالدینی نے مزید کہا کہ ان کے اپنے خاندان کے کم سے کم

ریاستی جبر کی یہ تاریک رات کب ختم ہوگی؟
6 سال پہلے 15 سالہ سلیمان کو جبری طور پر اٹھالیا گیا تھا
سلیمان کی ماں اور بھائی اس کی آواز سننے اور چہرہ دیکھنے کو ترس گئے ہیں

سات افراد کو اٹھانے کے بعد قتل کر دیا گیا جبکہ پانچ افراد ابھی تک لاپتہ ہیں۔ اوران کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہے اس لئے یہ مسئلہ ان کے لئے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''میری پارٹی نے آئین میں کی گئی 21 ویں ترمیم کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس ترمیم کے تحت فوجی عدالتوں میں سویلین مقدمات چلانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ہماری پارٹی نے اس پر ہونے والی ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا''۔ انہوں نے مزید کہا ''بدقسمتی سے ملک سے بائیں بازو کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں نے یا تو غیر سرکاری تنظیموں میں شمولیت اختیار کرلی ہے یا پھر وہ میڈیا کا حصہ بن گئے ہیں۔

عاصمہ جہانگیر نے کہا کہ وہ طویل عرصہ سے گمشدہ افراد کے معاملے کو دیکھ رہی ہیں۔ ''میرا مشاہدہ ہے کہ کچھ جج تو گمشدہ افراد کا معاملہ بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں جبکہ دوسرے جج ایسے معاملات میں سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیتے۔ بعض غیر سرکاری تنظیمیں انتہائی خلوص کے ساتھ کام کررہی ہیں لیکن کچھ ایسی تنظیمیں ہیں جو گمشدہ افراد کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں۔ اگر دو افراد غائب ہیں تو ہمیں دو کو بیس کی تعداد میں منتقل نہیں کرنا چاہئے۔ وہ لوگ جو نظر بندی مراکز میں ہیں اور وہ جو تاوان کے لیے اغواء کئے گئے ہیں، ان کو گمشدہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے لیکن اس کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہئے۔ عاصمہ جہانگیر نے مزید کہا کہ لوگوں کو عدالتوں سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔ اب آپ نے اجازت دے دی ہے کہ فوجی عدالتیں شہریوں پر مقدمات کی سماعت کرسکیں گی۔ عاصمہ جہانگیر نے کہا کہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان افتخار چوہدری نے گمشدہ افراد کا مسئلہ اٹھایا تھا لیکن ان کی زیادہ دلچسپی مسئلہ پر توجہ دینے کی بجائے خبریں بنانے پر مرکوز رہی۔ چند جج اس قدر بزدل ہیں کہ ان سے نمٹنے کے لئے تو انٹیلی جنس بیورو کا ایک انسپکٹر ہی کافی ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم اپنی مسلح افواج کی حمایت کرتے ہیں لیکن اپنی آزادی کی قیمت پر نہیں''۔

انسانی حقوق کی ایک متحرک کارکن طاہرہ عبداللہ نے کہا کہ پاکستان کو ''جبری گمشدہ افراد سے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن'' پر دستخط کردینے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ ''بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسی باتیں تب سننے میں آتی ہیں جب ان کے بارے میں پوری دنیا میں آوازیں بلند ہونا شروع ہوتی ہیں''۔ انسانی حقوق کے ایک اور متحرک کارکن امداد چانڈیو نے کہا کہ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں لوگوں کو گرفتار کیا جاتا، ان پر تشدد کیا جاتا اور ان کے خلاف مقدمے درج کرکے جیلوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن اب تو صورتحال یہ ہے کہ کوئی مقدمہ درج کئے بغیر لوگوں کو اٹھالیا جاتا ہے اوران کے عزیز اقارب کو اطلاع دیئے بغیر غائب کردیا جاتا ہے۔ یہ انسانی حقوق سے متعلق قانون کی خلاف ورزی ہے۔ یوتھ پارلیمنٹ کے سابق رکن اور قانون کے طالب علم ابراہیم خان نے ڈان کو بتایا کہ بعض واقعات سن کر انہیں شدید دھچکا لگا۔ ''میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ میرے کسی عزیز کو اس طرح غائب کردیا جائے۔ کاش کہ میں ان خاندانوں کی کوئی مدد کرسکتا۔ بہرحال میں موجودہ یوتھ پارلیمنٹ کے ارکان کے علم میں یہ بات لاؤں گا''۔ سیمینار کے بعد نیشنل پریس کلب کے باہر جبری گمشدگی کے واقعات کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

ملتان پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی ملتان ٹاسک فورس کے زیراہتمام آج مورخہ 30 اگست 2015 کو جبری گمشدگی سے متاثرہ افراد کے عالمی دن کے موقع پر علامہ

اقبال پارک تا پریس کلب ملتان تک پرامن ریلی اور مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد، سول سوسائٹی، وکلاء، طلباء اور شہریوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ شرکاء نے بڑی تعداد میں پلے کارڈ اور بینر اٹھا رکھے تھے۔

ہائی سینٹ پیٹر نے شرکاء سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ہم تمام شہری اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کسی بھی ملزم پر عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں اور ان مقدمات کا قانون کے مطابق فوری فیصلے کئے جائیں نا کہ انہیں جبری گمشدہ کیا جائے۔

محمد حسین کھوکھر نے کہا کہ ریاست اقوام متحدہ کے بین الاقوامی میثاق کا پاس کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائے کہ کسی کو جبری گمشدگی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ اس شخص سے غیر انسانی سلوک کیا جائے گا۔

سابقہ ایم پی اے نفیس احمد ایڈووکیٹ سپریم کورٹ نے کہا کہ جب آئین اور قانون میں ایک طریقہ کار موجود ہے تو اس سے انحراف کیوں کیا جاتا ہے۔ گرفتار شخص کو 24 گھنٹے کے اندر علاقہ مجسٹریٹ کے پاس پیش کرنا ضروری ہے۔ اب تو حالات اس طرح کے ہو رہے ہیں کہ شہری گم ہو رہے ہیں۔ کوئی بھی ادارہ اس بات کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں تو پھر یہ افراد کہاں غائب ہو رہے ہیں۔ آخر میں تمام شرکاء کی جانب سے ریاست سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کسی بھی فرد یا ملزم کو جبری طور گمشدگی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

ریلی کے شرکاء سے بات چیت کرتے ہوئے فیصل تنگوانی نے کہا کہ تمام گمشدہ افراد کو زندہ بازیاب کر کے قانون کے مطابق فورا عدالتوں میں پیش کیا جائے اور ان کے خلاف شفاف کاروائی کی جائے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ریاست جبری گمشدہ افراد کی فہرست مرتب کر کے اعلی عدلیہ تک پہنچائے۔ ریاست جبری گمشدگی جیسے واقعات کو غیر قانونی قرار دے اور جبری طور پر گمشدہ افراد کے تمام اہل خانہ کو تحفظ فراہم کرے۔ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ جبری گمشدگیوں کی آئین پاکستان کے آرٹیکل 9 اور 10 کے تحت تحقیقات کروائے اور ذمہ داروں کے خلاف سخت اقدامات کر کے اس عمل کو یقینی بنائے کہ آئین اور قانون سے بڑھ کر کوئی بھی شخص مبرا نہیں ہے۔ تمام متاثرین کو انصاف مہیا کیا جائے اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔

(ایچ آر سی پی سپیشل ٹاسک فورس ملتان)

کوئٹہ جبری طور پر لاپتہ کیے گئے افراد کے عالمی دن کے موقع پر پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں ایک احتجاجی مظاہرہ ہوا ہے۔ جس میں بڑی تعداد میں لاپتہ ہونے والے افراد کے لواحقین نے شرکت کی۔ 30 اگست کو ہونے والے اس مظاہرے کا انعقاد قوم پرست جماعت بلوچ نیشنل موومنٹ نے کیا تھا۔ مظاہرے کے شرکاء نے حقوق انسانی کی تنظیموں سے اپیل کی کہ وہ بلوچستان میں انسانی کی حقوق کی پامالی کو روکنے اور لاپتہ افراد کی بازیابی میں اپنا کردار ادا کریں۔ مظاہرے میں شریک ایک خاتون کا کہنا تھا کہ لاپتہ افراد کے عالمی دن کے موقع پر اس مظاہرے کا مقصد نبیل بلوچ کی جبری گمشدگی اور بلوچستان میں مبینہ ریاستی آپریشن کی جانب توجہ دلانا ہے۔ نبیل بلوچ کے بارے میں اُن کی جماعت کا کہنا ہے کہ انھیں گذشتہ سال کراچی سے جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا۔ بلوچستان میں لوگوں کی جبری گمشدگی کا آغاز سنہ 2000 کے بعد شروع ہوا۔ مظاہرے کے شرکاء کا کہنا تھا کہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ رواں سال کے دوران صرف جولائی کے مہینے سے اب تک 53 افراد کو جبری طور پر لاپتہ کیا گیا جبکہ 35 افراد کی تشدد زدہ لاشیں برامد ہوئی ہیں۔ بلوچستان سے لاپتہ ہونے والے افراد کی تعداد کے بارے میں متضاد دعوے سامنے آتے ہیں۔ بلوچستان کے محکمہ داخلہ کے ذرائع کا کہنا ہے کہ لاپتہ ہونے والے افراد کی تعداد ڈیڑھ سو زائد نہیں ہے۔ اس کے برعکس لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کی تنظیم وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا کہنا ہے کہ لاپتہ افراد کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مظاہرے میں شریک وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نائب چیئرمین ماما قدیر بلوچ نے کہا کہ جب انھوں نے کوئٹہ سے اسلام آباد تک لانگ مارچ شروع کیا تھا تو اقوام متحدہ اور یورپی یونین کو فراہم کی گئی فہرست کے مطابق 18 ہزار لاپتہ افراد تھے اور موجودہ حکومت کے دور میں بھی ہزاروں افراد کو لاپتہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہ اُن کی تنظیم کے نمائندے ضلعی سطح تک موجود ہیں، جو لاپتہ افراد کی فہرستیں مرتب کرتے ہیں۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

حیدرآباد پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اسپیشل ٹاسک فورس حیدرآباد کی جانب سے 30 اگست 2015، "جبری گمشدگی کے متاثرین کے عالمی دن" کے موقع پر ریلی اور مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ گمشدہ افراد کی زندہ بازیابی کے بینر تلے انسانی حقوق کے کارکنان، سیاسی، سماجی اور وکلاء برادری عورتوں اور طالبعلموں نے پریس کلب سے ریڈیو پاکستان روڈ تک مارچ کیا۔ ریلی کی اگلی صفوں میں خاتون رہنما حسین مسرت، نسیم جلبانی، مزدور رہنما پنھل ساریو، اقلیتی حقوق کے سرگرم کارکن پرویز مسیح کے علاوہ سماجی تنظیموں کے نمائندوں بلاول ناغر، رئیس اختر، اصغر لغاری، رضوان عباسی، بگھوان داس بھیل، ایڈووکیٹ کنگیر یزی اور ایچ آر سی پی ٹاسک فورس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر اشوتھاما، غفرانہ آرائیں، لالا عبدالحلیم اور دیگر کارکنان شامل تھے۔ ریلی کے شرکاء نے نعرے لگا کر لوگوں کی گمشدگیوں کی مذمت کی۔ ریلی کے دوران گمشدہ افراد کی باحفاظت بازیابی، ان کو عام عدالتوں میں پیش کرنے اور ملوث اغوا کاروں کو مجرم قرار دینے کے مطالبات کیے گئے۔ شرکاء نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اقوام متحدہ کے تمام افراد کی جبری گمشدگی سے تحفظ کے اعلامیے کی منظوری دی جائے۔ پنھل ساریو نے اس موقعے پر میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا چار دہائیوں سے بلوچستان میں ریاستی جبر اور آپریشن کی آڑ میں ہزاروں بلوچ نوجوانوں کو اغوا کر کے گم کر دیا گیا ہے۔ سیکڑوں نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشیں ملیں۔ متعدد سیاسی کارکنوں کو ریاست دشمنی، غداری اور تخریب کاری کے الزام میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا اسی ظلم ستم کے نتیجے میں بلوچستان سیاسی، سماجی اور معاشی بحرانوں کا شکار ہو گیا ہے اور اب وہاں پر پرامن جمہوری رویوں کے بجائے عسکریت پسندی کے رجحانات ہر سطح پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ پنھل ساریو نے کہا معدنی وسائل سے مالا مال اور سمندری سرمائے کے باوجود وہاں غربت، عدم صحت اور تعلیم کی وجہ سے سیاسی محرومی نے جنم لیا ہے۔ جس کو فقط گفتگو اور بہتر قانونی رویوں سے سنبھالا جا سکتا ہے۔ حسین مسرت شاہ نے کہا کہ بلوچستان کے بعد اب سندھ میں بھی انسانی حقوق کی پامالیاں شروع ہو گئی ہیں اور اختلاف رائے اور سیاسی اظہار رائے کو بندوق کے زور پر دبانے کوشش کی جا رہی ہے۔

امن، رواداری اور جمہوری جدوجہد کا ماضی رکھنے والا یہ صوبہ اب ریاستی جبر اور نوجوانوں کی جبری گمشدگیوں اور مسخ شدہ لاشوں کے ملنے کے بعد مایوسی اور غصے کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر اشوتھاما نے اس موقعے پر گزشتہ ماہ ٹاسک فورس آفس میں منعقدہ میٹنگ جو سندھ میں جبری گمشدگیوں کی صورتحال کے متعلق تھی بتایا کے میٹنگ کے شرکاء میں گمشدہ افراد کے لواحقین، ٹارچر کی صعوبتیں جھیل کر واپس آنے والے افراد اور اغوا کے بعد قتل کیے گئے کارکنان کے والدین شامل تھے۔ ان تمام لوگوں نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کے متعلق کہا کے وہ ملک کے کسی بھی قانون، آئین یا عدالت کے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اسی لیے وہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اٹھاتے ہیں ان پر تشدد کرتے ہیں اور دوران تفتیش کا غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویہ اختیار کرتے ہیں لوگوں کو قتل کر کے جانوروں کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ اس بھیانک صورتحال سے نکلنے کے لیے نہ صرف سویلین حکومت کو واضح پالیسی اختیار کرنی ہوگی بلکہ تمام سیاسی اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو مل کر جدوجہد کرنا پڑے گی۔

(ڈاکٹر اشوتھاما)

(پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اسپیشل ٹاسک فورس حیدرآباد)

30اگست 2015: ایچ آر سی پی کے کارکنان نے

'جبری گمشدہ افراد کے عالمی دن'

پر ملک کے مختلف حصوں میں تقاریب کا اہتمام کیا

حکام اختیارات کو عوام کی بہتری کے لئے استعمال کریں: سحر (SAHR)

انسانی حقوق کا تحفظ کرنے والے ایک علاقائی نیٹ ورک ساؤتھ ایشئنز فار ہیومن رائٹس (ایس اے ایچ آر) نے بھارت کی ایک متحرک سماجی کارکن تیستا سیتلواد اور ان کے شوہر جاوید آنند کو بھارتی حکام کی طرف سے تسلسل کے ساتھ ہراساں کرنے کے عمل کی شدید مذمت کی ہے۔ ایس اے ایچ آر نے بنگلہ دیشی انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل کی طرف سے جنوشاستھیا کیندرا کے بانی ظفر اللہ چوہدری کو توہین عدالت پر دی جانے والی سزا پر بھی ملامت کی ہے۔ ظفر اللہ چودھری پر الزام تھا کہ انہوں نے ڈیوڈ برگمین کی سزا کے خلاف تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ انسانی حقوق کی پاکستانی کارکن نور مریم کنور کو دھمکیاں دی گئیں اور انہیں خوفزدہ کیا گیا تھا۔ نور مریم کنور پاکستان یوتھ الائنس کی چیئر پرسن/ ڈائریکٹر ہیں۔ سحر (SAHR) کے مطابق سماجی کارکنوں کے خلاف ایسی گھناؤنی کارروائیوں کے باعث جنوبی ایشیائی ممالک کی سول سوسائٹی کے لئے تسلسل کے ساتھ کام کی گنجائش کا کم ہونا انتہائی تشویشناک بات ہے اور اس عمل کو یہیں پر روکنے کی اشد ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ اپریل 2015ء کے اختتام تک بھارت میں غیر ملکی مالی امداد فنڈ سے چلنے والی تقریباً نو ہزار غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کو بند کر دیا گیا تھا۔ ان پر الزام تھا کہ یہ تنظیمیں ملک کے ٹیکس قواعد پر عمل نہیں کرتیں۔ خاص طور پر بین الاقوامی این جی اوز، فورڈ فاؤنڈیشن، گرین پیس اور ان کے مقامی شراکت داروں پر پابندی لگانے کے ساتھ ساتھ ان کے بنک اکاؤنٹس تک منجمد کر دیئے گئے۔

مزید برآں جولائی 2015ء میں انڈین سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن (سی بی آئی) نے سماجی کارکن تیستا سیتلواد اور ان کے شوہر جاوید آنند کے دفاتر اور گھر پر چھاپے مارے۔ سی بی آئی نے غلام محمد پیش امام کے گھر اور سب رنگ کمیونیکیشنز اینڈ پبلشنگ کے دفتر کی تلاشیاں اسی الزام کے حوالے سے لیں۔ یاد رہے کہ مالیاتی بے باضابطگیوں کے الزام کے حوالے سے چھاپوں میں تیستا سیتلواد اور ان کے شوہر جاوید آنند نے تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے خلاف کی جانے والی کارروائی سے لگتا ہے کہ انہیں 2002ء کے گجرات فسادات میں جاں بحق ہونے والے ہزاروں افراد کو انصاف دلانے کی جدوجہد کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کی سزا دی جا رہی ہے۔

یاد رہے کہ بھارت کے موجودہ وزیراعظم 2002ء کے فسادات کے دوران گجرات کے وزیراعلیٰ تھے۔ بنگلہ دیش میں جون 2015ء میں دی انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل (آئی سی ٹی) نے ڈاکٹر ظفر اللہ چودھری کو توہین عدالت کا مرتکب اس لئے قرار دیا تھا کہ انہوں نے برطانوی صحافی ڈیوڈ برگمین کو دی جانے والی سزا پر تنقید کی تھی اور ڈاکٹر ظفر اللہ کو پانچ ہزار ٹکہ (روپیہ) جرمانہ کیا گیا اور ساتھ ہی جولائی میں ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ بھی درج کروا دیا گیا۔

قبائلی رہنما بیٹے سمیت ہلاک

قلات قلات میں فائرنگ کے واقعے میں اہم مقامی قبائلی رہنما سمیت چار افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ قبائلی رہنما علی محمد حسنی کے قافلے پر حملے کا یہ واقعہ 12 اگست کو ضلع قلات کے علاقے گدر میں پیش آیا۔ سوراب میں انتظامیہ کے ایک اہلکار نے بتایا کہ قبائلی شخصیت علی محمد حسنی ضلع خاران سے سوراب کی جانب جا رہے تھے۔ ان کے قافلے میں شامل گاڑیاں جب زبر کراس کے مقام پر پہنچیں تو پہلے سے گھات لگائے نامعلوم مسلح افراد نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے نتیجے میں علی محمد، ان کا آٹھ سالہ بیٹا اور دو دیگر افراد ہلاک ہو گئے جبکہ فائرنگ سے تین دیگر افراد زخمی بھی ہوئے۔ واقعے کے بعد حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انتظامیہ کے اہلکار کے مطابق یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ قافلے میں شامل ایک گاڑی میں آگ لگ گئی جس کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے ایک شخص کی لاش جھلس بھی گئی۔ انتظامیہ کے ایک اہلکار کے مطابق تاحال اس حملے کا مقدمہ درج نہیں کیا گیا جس کے باعث یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس حملے کا محرک قبائلی دشمنی ہے یا کچھ اور۔ یاد رہے کہ گذشتہ روز صوبہ بلوچستان میں ہی بم دھماکے اور تشدد کے دیگر واقعات میں ایک پولیس اہلکار سمیت پانچ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں سے چار افراد کی تشدد زدہ لاشیں بلوچستان کے مختلف علاقوں سے برآمد کی گئی تھیں۔

(نامہ نگار)

مجوزہ سائبر کرائم بل: سیاسی رہنماؤں اور سول سوسائٹی کے تحفظات

پشاور پاکستان کے صوبے خیبر پختونخوا میں سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں، سول سوسائٹی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد نے مجوزہ سائبر کرائم بل پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت اس قانون کو اختلاف رائے کو دبانے کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ 11 اگست کو پشاور پریس کلب میں مجوزہ سائبر کرائم بل پر مشاورتی نشست منعقد کی گئی جس میں سیاسی جماعتوں اور قبائلی علاقوں کے مقامی رہنماؤں کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں اس قانون کی اشد ضرورت ہے لیکن قانون عوام کی سہولت کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ اس قانون کے ذریعے سیاسی مخالفین کی رائے کو دبایا جائے۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ مجوزہ قانون میں ایسے نقاط شامل ہیں جن کی وضاحت نہیں کی گئی۔ شرکا نے مبہم قانون پر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اس مشاورتی نشست میں قانون ساز اسمبلیوں سے کہا گیا ہے کہ ایسا کوئی قانون منظور نہ کیا جائے جس میں عوامی فلاح اور بنیادی حقوق کو مدِ نظر نہ رکھا گیا ہو۔ خیبر پختونخوا سول سوسائٹی کے عہدیدار قمر نسیم نے بی بی سی کو بتایا کہ موجودہ حکومت کے سائبر کرائم بل بنایا ہے لیکن ابھی تک پارلیمان سے اس بل کی منظوری ہونا باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قانون میں شامل بعض نقاط جیسے کہ سائبر دہشت گردی کی وضاحت نہیں کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ سٹیٹ سکیورٹی میں حکومتی اور سرکاری اداروں کے علاوہ عوام کی سکیورٹی کے حوالے سے ذکر نہیں ہے۔ قمر نسیم نے بتایا کہ اس نشست میں یہاں بیشتر سیاسی جماعتوں کی نمائندگی ہے لیکن جماعت اسلامی اور جمعیت علما اسلام کے عہدیدار شامل نہیں ہے۔ خیبر پختونخوا سول سوسائٹی کے مطابق اکثر سیاسی جماعتوں نے اس بل کو مسترد کیا ہے۔ بنیادی طور پر سائبر کرائم بل یا پریوینشن آف الیکٹرانک کرائم بل 2015ء موجودہ حکومت نے پیش کیا ہے۔ ان دنوں ملک بھر میں اس پر بحث کی جا رہی ہے۔ قائمہ کمیٹی سے بل منظور ہو گیا ہے اور اسے اب پارلیمان میں منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس قانون سے انٹرنیٹ کے ذریعے کیے گئے جرائم کو روکنے میں مدد ملے گی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ صرف فیس بک یا ٹوئٹر وغیرہ نہیں بلکہ اب لوگ خرید و فروخت اور بڑے معاہدے آن لائن یا انٹرنیٹ کے ذریعے کرتے ہیں اور انھیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون سازی کی جا رہی ہے۔ اس بارے میں عوامی ورکر پارٹی کے رہنما انجینئر فخر زمان نے بی بی سی کو بتایا کہ حکومت کو سائبر کرائم بل میں ان ترقی یافتہ ممالک کی مدد ضرور لینی چاہیے، جنھوں نے اس ضمن میں پہلے سے قانون سازی کر رکھی ہے۔ اس اجلاس میں سیاسی جماعتوں کے بڑے رہنما شریک نہیں ہوئے۔ منتظمین کا کہنا تھا کہ سائبر کرائم بل کے بارے میں تمام صوبوں سے رائے لے کر حتمی سفارشات حکومت کو جلد پیش کر دی جائیں گی۔

(بی بی سی اردو)

ریاستی ناکامی کی طویل داستان کا نیا باب

آئی۔اے۔رحمان

اسلام آباد میں کچی آبادی کے مکینوں کو ظالمانہ انداز سے بے دخل کرنے اور مظاہرین کے خلاف دہشت گردی کے مقدمے درج کرنے کا عمل اپنی بنیادی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ریاستی ناکامی کی طویل داستان کا نیا باب ہے۔عوام کے رہائش کے حق کو تسلیم کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ملک کے تمام حصوں میں وسیع پیمانے پر بے دخلیوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

اسلام آباد 1/11، کچی آبادی جسے افغان بستی کہا گیا تا کہ متاثرین کے لیے عوامی ہمدردی میں کمی لائی جائے، وہاں کے رہایشیوں کو جس تشدد آمیز سلوک کا نشانہ بنایا گیا،اس سے کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ یہ واضح نہیں کہ آیا متبادل رہایش کے حوالے سے متاثرہ افراد کے ساتھ معاملہ طے کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ نہیں۔اور یہ کہ آبادی کو تین عشروں تک کیوں نظر انداز کیا جاتا رہا؟ کچی آبادی کے مکینوں کا حکومتی افسران کی رضامندی کے بغیر وہاں رہنا ناممکن تھا جو کہ بھاری فیس کے بغیر ناممکن ہے۔مظاہرین کے خلاف مقدمے درج کرنے کی بجائے کچی آبادی کے رہایشیوں سے مالی منفعت حاصل کرنیوالوں کو سزا دی جائے۔

ہمیں کچی آبادی کے مسئلے کا سامنا آزادی کے اگلے دن سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جونہی آبادی میں اضافہ ہوا اور اضافی دیہاتی آبادی نے شہری مراکز میں روزگار تلاش کیا،تقریباً تمام قصبوں اور شہروں کے کناروں پر کچی آبادیاں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔اسلام آبادی کی آبادی بڑھنے کے ساتھ اس شہر نے بھی مختلف نوعیت کے کاموں کے لیے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی طرف کھینچا۔ دارالحکومت میں بدصورت علاقوں پر نظر ڈالنے سے کراہت محسوس کرنے والے اکثر اس حقیقت کو صرف نظر کر دیتے ہیں کہ پاکستان کے یہ محروم شہری نمود و نمائش والے بڑے محلات کے مکینوں کو آرام مہیا کرنے کے علاوہ ملک کی غیر رسمی معیشت میں بھی بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔

کچی آبادی 1/11 کے ساتھ کیپیٹل ڈیولپمنٹ کے بھونڈے سلوک کے دفاع میں جو کچھ بھی کہا جائے، حقیقت یہ ہے کہ متاثرین کے رہائش کے حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا زندگی کے حق کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔تمام بے دخل خاندانوں کی جلد جلد از بحالی نو ہونی چاہیے۔

کچی آبادی کے مکینوں کے لیے سرکاری عزت واحترام کی کمی کا اندازہ تقریباً گزشتہ ایک عشرے سے اندرون ملک نقل مکینوں (آئی ڈی پیز) کے ساتھ رکھے جانے والے سلوک سے بھی ہو جاتا ہے۔نقل مکانی کی وجہ قدرتی آفت تھی یا کشیدگی، ریاست نے کبھی بھی متاثرین کے حوالے سے اپنا فریضہ ادا نہیں کیا جن کی اکثریت گزر بسر کرنے کے قابل نہیں تھی۔

آئی ڈی پیز کے معاملے کو ترجیح دینی چاہیے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے اپنا گھر بار نہیں چھوڑتے؛ وہ قدرت کی ستم گری کے باعث پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعض اوقات ریاست خود انہیں اپنا گھر بار چھوڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔

بدقسمتی سے آئی ڈی پیز کے ساتھ اکثر غیر ملکیوں اور غیر قانونی تارکین وطن جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سوات اور حال ہی میں فاٹا کے کشیدہ زدہ علاقوں سے بے دخل ہونے والے لوگوں کو سنبھالنے میں ناکامی سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا۔

تمام مبصرین کا خیال ہے کہ آئی ڈی پیز سرکار کے قائم کردہ خیموں میں رہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان میں انتہائی ضروری سہولیات کا بھی فقدان ہے۔ایسا لگتا ہے کہ نقل مکینوں کو کرائے کے مقامات پر یا اپنے دوستوں/ رشتہ داروں کے ہاں پناہ لیتے دیکھ کر حکام سکون محسوس کر رہے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی دلخراش حالات میں رہ رہے ہیں؛ ان کی زیادہ تعداد تنگ کمروں میں ریوڑوں کی شکل میں رہ رہی ہے۔انہیں صحت کے سنگین مسائل درپیش ہیں اور ان

> کچی آبادیاں جس طریقے سے نہ صرف قصبوں اور شہروں کے مضافات میں بلکہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد کی خوش پوش کالونیوں کے پہلو میں آباد ہوئیں اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ اس مسئلے کا بنیادی سبب بڑے شہروں میں لوگوں کی لگاتار منتقلی کے حوالے سے رہائشی سہولیات کی منصوبہ سازی میں ریاست کی نااہلی ہے۔ شہر سستی لیبر کی دستیابی کا تو خیر مقدم کرتے ہیں مگر وہ انہیں مناسب رہائش کی فراہمی میں سنجیدہ دلچسپی نہیں لیتے۔

کے بچوں کی تعلیمی ضروریات بمشکل ہی پورا ہوتی ہیں۔

کچی آبادی کے مکینوں اور آئی ڈی پیز کی ضروریات سے چشم پوشی کی وجہ شاید رہائشی سہولیات کی توسیع کا طویل المدتی منصوبہ تشکیل دینے میں ریاست کی عدم دلچسپی ہے۔ درحقیقت وقتاً فوقتاً کچی آبادیوں کو باضابطہ شکل دی جاتی رہی ہے جس نے تمام کچی آبادیوں کے رہائشیوں میں اس امید کو جنم دیا کہ اگر وہ ایک خاص طویل عرصے تک اپنی جگہ پر قابض رہتے ہیں تو وہ بھی اس استحقاق سے مستفید ہوں گے۔

کچی آبادیاں جس طریقے سے نہ صرف قصبوں اور شہروں کے مضافات میں بلکہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد کی خوش پوش کالونیوں کے پہلو میں آباد ہوئیں اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ اس مسئلے کا بنیادی سبب بڑے شہروں میں لوگوں کی لگاتار منتقلی کے حوالے سے رہائشی سہولیات کی منصوبہ سازی میں ریاست کی نااہلی ہے۔شہر سستی لیبر کی دستیابی کا تو خیر مقدم کرتے ہیں مگر وہ انہیں مناسب رہائش کی فراہمی میں سنجیدہ دلچسپی نہیں لیتے۔

یہاں تک کہ محروم طبقوں کو گزر بسر کے مہذب حالات کے لیے منظم کرنے کے لیے شروع ہونیوالا اورنگی پائلٹ پراجیکٹ، خدا کی بستی اسکیم اور آغا خان رورل سپورٹ پروگرام بھی حکام کو اس بات کی ترغیب نہیں دے سکے کہ وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی رہائشی سہولیات کو پورا کرنے کے لیے طویل المدتی منصوبہ سازی کریں۔رہائشی سہولیات کی طلب میں شدید اضافہ ہو رہا ہے جبکہ حکام کے سرپرنمود پسند دولتمندوں کے لیے جدید ٹرانسپورٹ اور سگنل فری راہداریوں کا بندوبست کرنے کا جنون طاری ہے۔ معلوم نہیں حکام بھدی نظر آنیوالی کالونیوں کی تعمیر کا سلسلہ کب تک جاری رکھیں گے اور لوگوں کو جھونپڑیوں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے، میں رہنے کے لیے کب تک مجبور کرتے رہیں گے؟ کیا انہیں اس امر پر قائل نہیں کیا جا سکتا کہ کچی آبادیوں کے اضافے سے بچنے کے لیے سرکاری قیمت پر رہائشی کالونیوں کے اراضی کا بندوبست کیا جائے اور غرباء کو موقع دیا جائے کہ وہ بتدریج وہاں اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق اپنے گھر تعمیر کر سکیں۔

حکومت نے شہری منصوبہ سازوں، ماہر تعمیرات، تحفظاتی ماہرین اور ماہرین ماحولیات کے مشوروں کو سننے کی بجائے سیاستدانوں کے جھانسوں پر کان دھرے ہیں اور ناقابل دفاع منصوبوں پر پیش رفت کے لیے وحشیانہ طاقت کا استعمال کیا ہے۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں ترقی کے نام پر ہونیوالی تباہی سے سب واقف ہیں۔حکومت بھی رہائشی سہولیات کے چیلنج سے نبٹنے کے لیے سول سوسائٹی کی خدمات سے خود کو اور عوام کو محروم کرنے پر کمربستہ ہے۔عوام کو ناقص نظم ونسق کی قیمت کچی آبادیوں سے پیدا ہونے والے مسائل، اندرون ملک دربدر ہونے والے (IDPs) آئی ڈی پیز کی دیکھ بھال کے فقدان اور جھونپڑیوں کی تعداد میں شدید اضافے کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔

ناقص نظم ونسق کا ایک خاص تباہ کن پہلو شہریوں کے مسائل سننے میں ریاست کی بڑھتی ہوئی ناکامی ہے۔ ہر روز ہزاروں عام پاکستانی شکایت کرتے ہیں کہ ریاست ان کے مصائب والم پر توجہ نہیں دے رہی۔ارباب اختیار کو احساس کرنا چاہیے کہ پاکستان جس صبر و برداشت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے اس کا سبب لاکھوں مردوں وعورتوں کی خاموش مشقت ہے جو ریاستی اداروں کی لاتعلقی اور اکثر عداوت کے باوجود مہذب گزر بسر کے حصول کے لیے سخت مشقت کر رہے ہیں۔عوام کی مشقت حکمرانوں کی حرص اور بے رحم اشرافیہ کی لوٹ مار کے خاتمے کا سبب بنتی ہے۔ اگر محروم طبقوں کو دیوار سے لگانے کا عمل اسی طرح جاری رہا تو صبر و برداشت کے انجن کام کرنا چھوڑ جائیں گے اور لالچی طفیلیوں کے پاس حکمرانی کرنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

کاری، کارو کہہ کر مار ڈالا:

مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور ''جہد حق'' کے نامہ نگاروں کی جانب سے بھجوائی جانے والی رپورٹوں کے مطابق 26 جولائی سے 25 اگست تک 9 افراد پر کاروکاری کا الزام لگا کر قتل کر دیا گیا۔ جن میں 14 خواتین اور 4 مرد شامل ہیں۔

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	آلہ واردات	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	واقعہ کی بظاہر کوئی اور وجہ	ایف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن / اخبار
26 جولائی	حسینہ مزاری	خاتون	۔	شادی شدہ	نظر مزاری اور ساتھی	بندوق	خاوند	گوٹھ عبداللہ مزاری، کشمور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
27 جولائی	فریدہ ملک	خاتون	۔	۔	نظر ملک اور خدا بخش ملک	گلا گھونٹ کر	چچا	گوٹھ اللہ ڈتو مزاری۔ کشمور۔ سندھ	۔	درج	دو گرفتار	روزنامہ کاوش
28 جولائی	مسماۃ رخسانہ گولاٹو	خاتون	۔	شادی شدہ	علی گل گولاٹو	بندوق	خاوند	گوٹھ عبدالکریم، بڈانی، کشمور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
02 اگست	ش	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عبدالغفار	بندوق	بھائی	ڈیرہ مراد جمالی	درج	۔	۔	روزنامہ انتخاب
02 اگست	غلام نبی	مرد	۔	غیر شادی شدہ	عبدالغفار	بندوق	۔	ڈیرہ مراد جمالی	درج	۔	۔	روزنامہ انتخاب
04 اگست	شمشاد خاتون	خاتون	23 برس	شادی شدہ	کسارو، غلام حسین	۔	چچازاد بھائی	فریکل کالونی سکھر۔ سندھ	۔	درج	گرفتار	روزنامہ کاوش
04 اگست	ہانجار بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	۔	خاوند	گوٹھ دانش کھوسو، پہنور سنہڑی، صحبت پور	۔	درج	۔	عوامی آواز
12 اگست	لیاقت علی کانڈھڑو	مرد	32 برس	۔	صوبل	۔	رشتے دار	گوٹھ ببر کانڈھڑو، ٹنڈو مستی، خیر پور میرس۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
12 اگست	و	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	بندوق	خاوند	گوٹھ غازیتوئی، رستم، شکار پور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
14 اگست	عظمت بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	بندوق	۔	بابا کوٹ، ڈیرہ مراد جمالی	۔	درج	۔	روزنامہ انتخاب
16 اگست	احمد علی چولیانی	مرد	30 برس	شادی شدہ	۔	بندوق	۔	گوٹھ نور محمد کھوسو، کندھ کوٹ، کشمور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
16 اگست	مسماۃ سوڈھی	خاتون	25 برس	شادی شدہ	۔	بندوق	۔	گوٹھ نور محمد کھوسو، کندھ کوٹ، کشمور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
16 اگست	کنول مگسی	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	بندوق	۔	گوٹھ امیر بخش مگسی، نواب شاہ۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
18 اگست	شاہدہ بروہی	خاتون	35 برس	۔	عباس بروہی	بندوق	بھائی	جٹیا محلّہ شہداد پور، سانگھڑ۔ سندھ	۔	درج	گرفتار	روزنامہ کاوش
18 اگست	س	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	محمد پناہ	بندوق	کزن	اوستہ محمد، بلوچستان	درج	۔	۔	روزنامہ انتخاب
21 اگست	پرویزاں جعفری	خاتون	۔	شادی شدہ	سعید باجکانی	بندوق	خاوند	گوٹھ تیغو جعفری، کندھ کوٹ، کشمور۔ سندھ	۔	درج	۔	روزنامہ کاوش
23 اگست	ق	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	۔	بندوق	۔	تحصیل زہری، خضدار	درج	۔	۔	روزنامہ انتخاب
23 اگست	عبدالمجید	مرد	۔	غیر شادیشدہ	۔	بندوق	۔	تحصیل زہری، خضدار	درج	۔	۔	روزنامہ انتخاب

دھماکے سے 3 سیکیورٹی اہلکار ہلاک

پشاور خیبر ایجنسی کے علاقہ وادی تیراہ میں 12 اگست کو بارودی سرنگ کے دھماکے کے نتیجے میں کیپٹن سمیت تین سیکیورٹی اہلکار ہلاک ہوگئے۔ایک سیکورٹی اہلکار کے مطابق خیبر ایجنسی وادی تیرا کے علاقہ سندانہ میں سیکورٹی فورسز کے اہلکار علاقے میں معمول کے گشت پر تھے کہ اس دوران بارودی مواد کا دھماکا ہوا جس کے نتیجے میں کیپٹن سمیت تین اہلکار شہید ہو گئے۔دھماکے کے نتیجے میں کیپٹن سمیت تین اہلکار ہلاک ہوگئے۔خیال رہے کہ اس علاقے میں صحافیوں کو رسائی حاصل نہ ہونے کے باعث اطلاعات کی آزادانہ تصدیق ممکن نہیں۔

(نامہ نگار)

چار پولیس اہلکار ہلاک

کراچی کراچی میں پولیس کے مطابق نامعلوم مسلح افراد نے فائرنگ کر کے چار پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا ہے۔کراچی ضلع شرقی کے ڈی آئی جی پولیس منیر شیخ نے بتایا کہ واقعہ 12 اگست کو کورنگی کے علاقے زمان ٹاؤن میں پیش آیا۔ان کے مطابق حملہ آوروں نے پولیس کی ایک موبائل پر فائرنگ کی اور ہوٹل پر بیٹھے ہوئے پولیس اہلکاروں کو بھی نشانہ بنایا۔منیر شیخ کے مطابق اس حملے میں چار اہلکار ہلاک اور چار زخمی ہوگئے جن میں ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھی شامل ہے۔تاحال کسی تنظیم کی جانب سے اس کارروائی کی ذمہ داری قبول نہیں کی گئی ہے۔شہر میں رواں برس 50 سے زیادہ پولیس افسران اور اہلکاروں کو نشانہ بنا کر ہلاک کیا جا چکا ہے۔ہلاک ہونے والے پولیس اہلکاروں میں ایک سابق جیل سپرنٹنڈنٹ اور متعدد ڈی ایس پیز اور ایس ایچ اوبھی شامل ہیں۔کراچی میں شدت پسندوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خلاف آپریشن کے آغاز کے بعد سے سیکورٹی اہلکاروں پر حملوں میں اضافہ ہوا ہے اور ان میں سے کئی حملوں کی ذمہ داری شدت پسند کالعدم تنظیم تحریکِ طالبان نے قبول کی تھی۔

رینجرز اور پولیس اہلکار کراچی کے مختلف علاقوں اور مضافات میں خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر شدت پسندوں اور کالعدم تنظیموں کے ارکان کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔رینجرز نے پچھلے ماہ ایک رپورٹ میں کہا تھا کہ آپریشن کے دوران دہشتگردی اور دوسرے دیگر جرائم کے دس ہزار (10000) سے زیادہ ملزمان گرفتار ہوئے جبکہ مقابلوں میں 364 مشتبہ جرائم پیشہ افراد مارے گئے۔

(نامہ نگار)

پشاور حملہ، ایک پولیس اہلکار ہلاک، سات زخمی

پشاور مسلح افراد کی طرف سے دو الگ الگ مقامات پر پولیس پر فائرنگ کے نتیجے میں ایک اہلکار ہلاک اور سات افراد زخمی ہوگئے ہیں۔پولیس کے مطابق کے یہ واقعات 14 اگست کی رات پشاور کے رہائشی علاقے حیات آباد میں پیش آئے۔حیات آباد پولیس سٹیشن کے انسپکٹر عالم زیب نے بتایا کہ رنگ روڈ پر رات کے وقت جشن آزادی کے جلوس اور ریلیاں گزر رہی تھیں کہ اس دوران موٹر سائیکل پر سوار دو مسلح افراد نے خیبر روڈ کے قریب ناکے پر موجود پولیس اہلکاروں پر فائرنگ کر دی جس سے ایک اہلکار ہلاک اور دو افراد زخمی ہوگئے۔انھوں نے بتایا کہ ان حملہ آوروں نے بعد میں باغ ناران کے سامنے سڑک پر موجود پولیس اہلکاروں پر بھی فائرنگ کی جس سے دو پولیس اہلکاروں سمیت پانچ افراد زخمی ہوئے۔پولیس اہلکار کے مطابق حملہ آور جشن آزادی کے جلوس میں موجود تھے تاہم بعد میں وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ اس واقعہ کے بعد حیات آباد میں پولیس کی نفری بڑھا دی گئی ہے اور ارد گرد کے علاقوں میں تلاشی کا عمل بھی تیز کر دیا گیا ہے۔ادھر دوسری طرف خیبر پختونخوا کے جنوبی شہر کوہاٹ میں سکیورٹی فورسز اور پولیس نے سرچ آپریشن کے دوران 21 مشتبہ شدت پسندوں کو گرفتار کر لیا ہے۔کوہاٹ کے علاقے جنگل خیل میں مختلف مقامات پر چھاپوں کے دوران 21 مشتبہ شدت پسندوں کو گرفتار کیا گیا ہے نیکورٹ پولیس کے ترجمان کے مطابق سنیچر کی صبح سکیورٹی فورسز اور پولیس نے شہر کے علاقے جنگل خیل میں مختلف مقامات پر چھاپوں کے دوران 21 مشتبہ شدت پسندوں کو گرفتار کر لیا۔تاہم ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ گرفتار ہونے والے افراد کون ہیں اور انھیں کس جرم کے تحت حراست میں لیا گیا ہے۔کوہاٹ میں چند ماہ کے دوران سرچ اینڈ سٹرائیک کاروائیوں کے دوران سینکڑوں عسکریت پسندوں اور غیر قانونی طور پر مقیم افغان شہریوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔

گرفتار ہونے والے درجنوں افغان شہریوں کو ملک بدر کیا جا چکا ہے۔خیال رہے کہ خیبر پختونخوا میں سکیورٹی کی صورتحال میں کافی حد تک بہتری دیکھی جا رہی ہے تاہم پولیس اہلکاروں کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔پولیس کے مطابق صوبے میں دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع ہوجانے کے بعد سے اب تک بارہ سو سے زائد پولیس اہلکار ہلاک ہو چکے ہیں۔جاں بحق ہونے والے بیشتر اہلکاروں کی عمریں 30 سال کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

پولیس پر لوگوں کو ہراساں کرنے کا الزام

قصور قصور میں بچوں سے مبینہ جنسی زیادتی کیس میں متاثرین کے وکیل نے الزام عائد کیا ہے کہ پولیس بے گناہ افراد کے گھروں میں چھاپے مار کر انھیں ہراساں کر رہی ہے۔متاثرین کے وکیل لطیف سرانے یہ بات 14 اگست کو قصور میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہی۔وکیل لطیف سرا کا کہنا ہے کہ پولیس ایسے افراد کے گھروں پر چھاپے مار رہی ہے جو جنسی زیادتی کیس میں ملوث نہیں ہیں۔وکیل کے مطابق پولیس نے بے گناہ افراد کے گھروں میں داخل ہو کر توڑ پھوڑ کی اور گھر کی خواتین سے بدتمیزی سے پیش آئے ہیں۔ڈی آئی جی ابوبکر خدا بخش کی سربراہی میں ایک مشترکہ تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی گئی تھی جو کہ پانچ روز سے قصور میں اپنی تحقیقات کر رہی ہے اور متاثرہ افراد کے بیانات قلمبند کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔سماجی کارکن نے مطالبہ کیا کہ ایس پی انوسٹی گیشن قصور کو معطل کیا جائے اور مظاہرین کے خلاف جھوٹے مقدمات کو فی الفور ختم کیا جائے۔مبین غزنوی نے کہا کہ اگر پیر تک جھوٹے مقدمات ختم نہ کئے گے تو پھر آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا جائیگا۔مبین غزنوی کا کہنا ہے کہ جنسی زیادتی میں ملوث جو ملزمان ابھی تک آزاد گھوم رہے ہیں اُن کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے کیونکہ اُن سے مدعی اور اُن کے اہلخانہ کو خطرہ لاحق ہے۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

''انتہا پسندی کے خاتمے کیلئے انسانیت دوست اقدار کا فروغ''

کے حوالے سے فیصل آباد، پھالیہ، بالاکوٹ، ہری پور اور گجرات میں دوروزہ تربیتی ورکشاپس کا انعقاد کیا گیا

فیصل آباد: 19-20 اگست

پھالیہ: 22-23 اگست

بالاکوٹ: 22-23 اگست

ہری پور: 24-25 اگست

گجرات: 25-26 اگست

انتہا پسندی کی روک تھام اور رواداری کے فروغ کے لیے منعقدہ تربیتی ورکشاپس کی رپورٹس

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے زیر اہتمام " انتہا پسندی کے خاتمے اور انسانیت دوست اقدار کے فروغ " کے عنوان سے ضلع شیخوپورہ میں 28 اور 29 جولائی اور تحصیل پیر محل ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں 31-30 جولائی جبکہ سندھ کی تحصیل قمبر ضلع شہداد کوٹ میں 30-29 جولائی کو ورکشاپ منعقد کی گئی۔ان تمام ورکشاپوں میں انسانی حقوق کے فروغ، حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے حکمت عملی کی تشکیل اور عوام تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار، انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں ریاستی اداروں کا کردار (ایک تجزیہ)، انتہا پسندی کیا ہے، اس کی مختلف اقسام ،ہماری زندگیوں پر اثرات اور روک تھام کیلئے لائحہ عمل، انتہا پسندی کے انسداد/فروغ میں میڈیا کا کردار اور ذرائع ابلاغ سے منسلک افراد کی تربیت کی اہمیت، طرز فکر میں مثبت تبدیلی اور جمہوری رویّوں کے فروغ کے لیے تعلیمی اداروں اور نصاب میں انسانی حقوق کی تعلیم کی شمولیت کی اہمیت اور جمہوریت اور انسانی حقوق، انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے مابین تعلق جیسے موضوعات زیرِ بحث رہے۔ شُرکاء میں صحافی، وکلاء، اُساتذہ، سماجی کارکنان ، طلبہ اور دیگر مکاتب فکر کے لوگ شامل تھے جن میں خواتین کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔علاوہ ازیں ورکشاپ میں " ہم انسان " اور "ضمیر کی عینک" جیسی دستاویزی فلمیں دکھائی گئیں۔شرکاء کے درمیان رواداری کے فروغ کے لیے گروپ ورک اور گیمز بھی کروائی گئیں۔ ورکشاپس کی کارروائی ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

شیخوپورہ 29-28 جولائی

ورکشاپ کے اغراض ومقاصد

عون محمد

پاکستان کی تاریخ میں ریاست بارہا اپنے شہریوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی مرتکب ہوئی ہے۔فرقہ وارانہ تشدد بڑھتا جارہا ہے۔انسانی حقوق کے کارکن بڑی تشویش کے ساتھ یہ بات نوٹ کر رہے ہیں کہ احمدیوں، مسیحوں، ہندوؤں اور دوسری اقلیتیں اقتصادی اعتبار سے محروم طبقات میں بھی شامل ہیں اور ان کو اپنے حقوق کے حصول سے محروم کیا جارہا ہے۔ مذہبی انتہا پسند انہیں ہراساں اور پریشان کررہے ہیں۔اسکے ساتھ ساتھ کچھ مخصوص گروہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے انتہا پسندی کے فروغ میں سرگرم ہے۔آپ کو اِس ورکشاپ میں بُلانے کا مقصد انتہا پسندی کے اِن عوامل اور محرکات کو کسی حد تک کم کرنے اور کمیونٹی میں مثبت سوچ وفکر کا فروغ ہے۔دہشت گردی، مذہبی اختلافات اور انتہا پسندی نے ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ بے روزگاری، نا انصافی اور صحت کے وسائل کی کمی نے پاکستان کی بنیادیں ہلا

حقوق حق کی جمع ہے اور حق سے مراد ایک ایسا مفاد ہے جس کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہر انسان کو پیدائش سے چند بنیادی حقوق مل جاتے ہیں مثلاً زندگی جینے کا حق، آزادی رائے کا حق ،معلومات لینے کا حق اور مل جل کر بیٹھنے کا حق۔ ہر دور کے علماء، صوفیا اور انقلابی رہنماؤں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے احتجاج میں آواز بلند کی ہے۔ اس تحریک کے باقاعدہ آغاز کا سراغ روم اور یونان سے ملتا ہے اور اس سلسلے میں ہمورابی کا قانون بہت اہمیت کا حامل ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔اس کے بعد یہ تحریک مختلف مراحل میں سے گزرتی ہوئی ایک عالمی منشور پر آکر رکی جس نے اس تحریک کو باقاعدہ اور منظّم شکل دی۔

کر رکھ دی ہیں۔تمام شرکاء سے گزارش ہے کہ ورکشاپ کے دوران سیکھی گئی انسانی حقوق کی تعلیم کو اپنے گھر، خاندان، سوسائٹی اور اداروں میں دوسروں تک پہنچائیں اور انتہا پسندی کے خلاف اِس کاوش میں ہمارا ساتھ دیں۔

انسانی حقوق کے فروغ، حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے حکمت عملی کی تشکیل اور عوام تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار

حفیظ بزدار

حقوق حق کی جمع ہے اور حق سے مراد ایک ایسا مفاد ہے جس کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہر انسان کو پیدائش سے چند بنیادی حقوق مل جاتے ہیں مثلاً زندگی جینے کا حق، آزادی رائے کا حق ،معلومات لینے کا حق اور مل جل کر بیٹھنے کا حق۔ ہر دور کے علماء، صوفیا اور انقلابی رہنماؤں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے احتجاج میں آواز بلند کی ہے۔ اس تحریک کے باقاعدہ آغاز کا سراغ روم اور یونان سے ملتا ہے اور اس سلسلے میں ہمورابی کا قانون بہت اہمیت کا حامل ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔اس کے بعد یہ تحریک مختلف مراحل میں سے گزرتی ہوئی ایک عالمی منشور پر آکر رکی جس نے اس تحریک کو باقاعدہ اور منظّم شکل دی۔ آج 192 ممالک اس معاہدے کے رکن ہیں۔

حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے خودکار نظام کے تحت ٹیکسوں کے ذریعے وسائل اکٹھے کرتی ہے جیسے ڈائریکٹ ٹیکس ہے جو عوام خود جا کر حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے ڈائریکٹ ٹیکس کہلاتا ہے۔ مثلاً پراپرٹی کی خرید وفروخت پر یا پھر کوئی لائسنس بنوانے پر یا پھر گاڑی، ادارہ وغیرہ رجسٹر کروانے پر حکومت عوام سے ٹیکس لیتی ہے ۔اسی طرح ان ڈائریکٹ ٹیکس ہے جو کہ ہم لوگ بالواسطہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔مثلاً مختلف کمپنیاں اپنے اوپر لگنے والے ٹیکس قیمت میں شامل کر دیتی ہیں سیلز ٹیکس وغیرہ۔اگر ہم اندازہ لگائیں تو ایک سیاسی حلقے میں ایک دن کا ٹیکس تقریباً 50 لاکھ روپے جمع ہوتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا ٹیکس جمع کرانے والوں کو کیا حکومت ان کے حقوق بہم فراہم کر رہی ہے؟ انسانی حقوق کو لوگوں تک پہچانے کا طریقہ بھی خود کار سسٹم کی طرح ہونا چاہیے۔یعنی لگاتار، مسلسل چلنے والا سسٹم۔ تمام لوگوں کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہونے چاہیے۔

ہمارے گردونواح میں با اثر افراد نے سیاست کو ذاتی کاروبار یا جاگیر بنا لیا ہے۔ہم لوگ بھی ووٹ کاسٹ کرتے وقت اپنے محلوں کے چودھریوں کو سامنے رکھتے ہیں۔کسی بھی پارٹی کا منشور یا قیادت کے نظریات کی قدر نہیں کرتے۔جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں لوگ ووٹ صرف اور صرف پارٹی منشور یا پھر پارٹی قیادت کے مستقبل کے منصوبے کو سامنے رکھ کر کاسٹ کرتے ہیں۔وہاں سیاست ایک ادارہ ہے جو بھی اہل انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے احتجاج میں آواز بلند کی ہے۔اس تحریک کے باقاعدہ آغاز کا سراغ روم اور یونان سے ملتا ہے اور اس سلسلے میں ہمورابی کا قانون بہت اہمیت کا حامل ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔اس کے بعد یہ تحریک مختلف مراحل میں سے گزرتی ہوئی ایک عالمی منشور پر آکر رکی جس نے اس تحریک کو باقاعدہ اور منظّم شکل دی۔ آج 192 ممالک اس معاہدے کے رکن ہیں۔ حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے خودکار نظام کے تحت ٹیکسوں کے ذریعے وسائل اکٹھے کرتی ہے جیسے ڈائریکٹ ٹیکس ہے جو عوام خود جا کر حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے ڈائریکٹ ٹیکس کہلاتا ہے۔ مثلاً پراپرٹی کی خرید وفروخت پر یا پھر کوئی لائسنس بنوانے پر یا پھر گاڑی، ادارہ وغیرہ رجسٹر کروانے پر حکومت عوام سے ٹیکس لیتی ہے ۔اسی طرح ان ڈائریکٹ ٹیکس ہے جو کہ ہم لوگ بالواسطہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔مثلاً مختلف کمپنیاں اپنے اوپر لگنے والے ٹیکس قیمت میں شامل کر دیتی ہیں سیلز ٹیکس وغیرہ۔اگر ہم اندازہ لگائیں تو ایک سیاسی حلقے میں ایک دن کا ٹیکس تقریباً 50 لاکھ روپے جمع ہوتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا ٹیکس جمع کرانے والوں کو کیا حکومت ان کے حقوق بہم فراہم کر رہی ہے؟ انسانی حقوق کو لوگوں تک پہچانے کا طریقہ بھی خود کار سسٹم کی طرح ہونا چاہیے۔یعنی لگاتار، مسلسل چلنے والا سسٹم۔ تمام لوگوں کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہونے چاہیے۔

ہمارے گردونواح میں با اثر افراد نے سیاست کو ذاتی کاروبار یا جاگیر بنا لیا ہے۔ہم لوگ بھی ووٹ کاسٹ کرتے وقت اپنے محلوں کے چودھریوں کو سامنے رکھتے ہیں۔کسی بھی پارٹی کا منشور یا قیادت کے نظریات کی قدر نہیں کرتے۔جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں لوگ ووٹ صرف اور صرف پارٹی منشور یا پھر پارٹی قیادت کے مستقبل کے منصوبے کو سامنے رکھ کر کاسٹ کرتے ہیں۔وہاں سیاست ایک ادارہ ہے جو بھی اہل

ہوگا اسے موقع ملے گا۔ جبکہ ہمارے ہاں سیاست موروثیت کا شکار ہے۔ یہاں ہمارے سیاسی حقوق کو قتل کیا جا رہا ہے۔

ہمارہ معاشرہ 5 معاشرتی ستونوں پر کھڑا ہے: خاندان، تعلیم، مذہب، اکنامکس اور سیاست۔ ہماری سوچ کی بنیاد ہمارے خاندان سے شروع ہوتی ہے جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہم آس پاس ہونے والے عوامل کو آہستہ آہستہ اپنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طرز فکر میں تبدیلی کا پہلا سبب خاندان ہے۔ دُنیا میں ہزاروں زُبانیں بولی جاتی ہیں جو کہ حالت و واقعات اور ضروریات کی پیش نظر سامنے آئیں۔ لیکن آج ہر زبان کی اپنی الگ پہچان ہے۔ اِس طرح مذاہب بھی مختلف ہیں اور ہر کسی کو ایک دوسرے کے عقیدے اور ایمان کی عزت کرنی چاہیئے۔ قرآن پاک میں کہیں بھی رب المسلمین نہیں لکھا گیا بلکہ رب العلمین لکھا گیا ہے۔ یہی ہمارا جمہوری روّیہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کریں۔ جب ہم جمہوریت کی آواز لگاتے ہیں تو پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے کہ کیا ہمارے روّیے اور ہمارے گھروں میں جمہوریت ہے؟ اصل

چنانچہ ہماری سوچ میں مثبت تبدیلی کے لیے ہمیں بنیادی انسانی حقوق کا پتہ ہونا بہت لازم ہے اور اِس کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم کا عام ہونا بہت ضروری ہے۔ لوگوں کو یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ حق کیا ہوتا ہے اور اُسے کیسے اور کہاں سے حاصل کرنا ہے۔ اِس کے لیے ریاست کا کردار مثبت ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ریاست ماں کی طرح ہوتی ہے اور جس طرح ہماری سوچ کی بنیاد ہمارا خاندان ہے اُسی طرح سوچ میں مثبت تبدیلی کے لیے ریاست کا کردار بھی اہم ہے۔

مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہمارے اندر جمہوری روّیے نہیں ہیں اور ملک میں کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں جو جمہوری روّیوں کے فروغ کے لیے کام کرتا ہو۔ اِسی طرح ہماری سوچ میں تبدیلی کے لیے ہماری کمیونٹی بھی کارفرما ہوتی ہے اور کمیونٹی میں ہماری درسگاہیں اور سکول بھی شامل ہیں۔ اور ہمارے سکولوں میں جو نصاب ہمیں پڑھایا جاتا ہے اُس سے ہماری سوچ کی مزید ترقی ہوتی ہے لیکن وہ مثبت ہے یا منفی یہ سلیبس پر منحصر ہے۔ ہمارے ملک پاکستان کے آئین میں بھی انسانی حقوق شامل ہیں لیکن جب تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں کہ ہمارے حقوق کیا ہیں اور ہم کس سے وہ حقوق مانگ سکتے ہیں یا کون ہمارے حقوق دینے کا مجاز ہے اُس وقت تک حقوق کا حصول ناممکن ہے۔

ہماری درسگاہوں اور سکولوں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں انسانی حقوق کی تعلیمات کا کہیں بھی ذکر نہیں جبکہ یورپین ممالک میں پانچویں جماعت تک طالب علموں کو اُن کے بنیادی حقوق کا پتا چل جاتا ہے۔

چنانچہ ہماری سوچ میں مثبت تبدیلی کے لیے ہمیں بنیادی انسانی حقوق کا پتہ ہونا بہت لازم ہے اور اِس کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم کا عام ہونا بہت ضروری ہے۔ لوگوں کو یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ حق کیا ہوتا ہے اور اُسے کیسے اور کہاں سے حاصل کرنا ہے۔ اِس کے لیے ریاست کا کردار مثبت ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ریاست ماں کی طرح ہوتی ہے اور جس طرح ہماری سوچ کی بنیاد ہمارا خاندان ہے اُسی طرح سوچ میں مثبت تبدیلی کے لیے ریاست کا کردار بھی اہم ہے۔

انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ کے میں ریاستی اداروں کا کردار

بشریٰ خالق

پاکستانی معاشرے کو بڑی حد تک لسانی اور ثقافتی تنوع، معاشی عدم مساوات، طبقات اور ذاتوں کی تقسیم، قبائلی اور خاندانی وفاداریوں، عوام اور خواص کے موروثی اختلافات نے مرتب کیا ہے، اور اسکے جمہوریت اور انسانی حقوق کے بارے میں روّیوں کو شکل دی ہے۔ ہمارے معاشرے کی سب سے نمایاں خصوصیت جاگیر دارانہ اور قبائلی سماجی نظام کی بالادستی ہے جسمیں مضبوط پدر سری اور استبدادی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سماجی طرز عمل انہی رجحانات سے تشکیل پاتا ہے۔ جن کا اظہار اختیارات پر کنٹرول اور وسائل پر اجارہ داری کے کلچر سے ہوتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں جاگیر داروں اور خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں قبائلی سرداروں کی دیہی آبادی پر گرفت، پاکستان میں عدم مساوات کی افزائش کا سب سے بڑا سبب بنی۔ سیاسی فیصلوں پر کنٹرول براہ راست یا بالواسطہ طور پر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جنکا مفاد صورتحال کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں ہی تھا۔ معاشی پالیسیوں میں بھی انہی کے مفادات کو سبقت ملتی رہی ہے۔ یکے بعد دیگرے فوجی حکومتوں نے بھی عام آدمی کو باہر رکھ کر اقتدار اور وسائل پر کنٹرول کی روایات کو دوام بخشنے کے لیے انہی عناصر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اثاثوں کی زیادہ منصفانہ از سرنو تقسیم کو کسی بھی سیاسی یا معاشی منصوبے کا حصہ نہیں بنایا گیا اور ہر آنیوالی حکومت نے اسے محض ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا۔ لہذا سیاسی ڈھانچہ کسی ریاستی پالیسی یا سماجی تحریک کی جانب سے سنگین چیلنج کا سامنا کئے بغیر جوں کا توں برقرار رہا ہے۔ سندھ میں جاگیرداری نظام پنجاب سے زیادہ طاقتور ہے جبکہ خیبر پختونخوا میں قبائلی نظام میں درجہ بندی بلوچستان کے سرداری نظام کے مقابلے میں کم ہے۔ سندھ اور پنجاب میں خصوصا جنوبی پنجاب میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ وسائل، یعنی زمین اور اسکی مصنوعات پر کنٹرول ہے۔ قبائلی معاشرے میں خاندان اور کنبے کے مضبوط رشتوں کا تقاضہ ہوتا ہے کی قبائلی خواص کی اطاعت کی جائے۔ اطاعت کے کلچر کی واضح مثال زمین کے مالک جاگیر دار اور کسان کے درمیان تعلق

پاکستانی معاشرے کو بڑی حد تک لسانی اور ثقافتی تنوع، معاشی عدم مساوات، طبقات اور ذاتوں کی تقسیم، قبائلی اور خاندانی وفاداریوں، عوام اور خواص کے موروثی اختلافات نے مرتب کیا ہے، اور اسکے جمہوریت اور انسانی حقوق کے بارے میں روّیوں کو شکل دی ہے۔ ہمارے معاشرے کی سب سے نمایاں خصوصیت جاگیر دارانہ اور قبائلی سماجی نظام کی بالادستی ہے جسمیں مضبوط پدر سری اور استبدادی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سماجی طرز عمل انہی رجحانات سے تشکیل پاتا ہے۔ جن کا اظہار اختیارات پر کنٹرول اور وسائل پر اجارہ داری کے کلچر سے ہوتا ہے۔

ہے۔

موثر زرعی اصلاحات پر عملدرامد میں ناکامی کے نتیجے میں بڑے بڑے قطعات اراضی پر ذاتی ملکیت قائم ہے۔ پاکستان میں زرعی اصلاحات کی جانب پہلی کوشش 1959ء میں اور دوسری 1972ء میں کی گئی جبکہ تیسری کوشش 1977ء میں ہوئی۔ یہ کوششیں بڑے بڑے قطعات اراضی کی ملکیت میں کوئی اہم تبدیلی لانے میں ناکام رہیں۔ زرعی اصلاحات کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ملکیت کی حد مقرر کرنے کا اصول تھا۔ ملکیت کی حد خاندانوں کی بجائے فرد کی ملکیت کی بنیاد پر مقرر کی گئی۔ اسطرح بیشتر جاگیرداروں کو زمین کی جعلی یا محض رسمی منتقلی کے ذریعے اصلاحات سے بچ نکلنے کا موقع ملا۔ بہت سے زمینداروں نے اصلاحات میں دوسرے قانونی سقم سے فائدہ اٹھایا اور مقررہ حد سے زائد اراضی اپنے قبضے میں رکھی۔ ریاست خود ایسے اداروں کو فروغ دینے میں ناکام رہی جن میں اس آبادی کے اجتماعی کردار کو سمویا جاسکتا جو اسے ورثے میں ملی تھی اور لسانی، نسلی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود مشترکہ مفادات کی ایک بنیاد تیار کی جا سکتی۔ ریاست کے مرکزی ڈھانچے پر مبنی حکومت قومی یکجہتی

کے لیے سازگار اور معاون نہیں تھی۔ سیاسی اور اقتصادی اختیارات میں عدم مساوات بڑھتی چلی گئی۔ ایک تنگ سماجی بنیاد سے لی گئی سیاسی قیادت، قومی یکجہتی کے بنیادی مسائل سے عہدہ برا ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ خواص نے ذیلی قومیتوں کے اظہار کو لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ قرار دیا اور سے کچلنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جس سے مسئلہ اور سنگین ہو گیا۔ آمرانہ حکومتوں اور کمزور جمہوریتوں نے مذہب، قومیت یا کسی مخصوص معاشی اور سیاسی نظام پر مبنی نظریات مسلط کرنے کے لیے نعروں کا سہارا لیا۔ ان نظریات کو ٹھونسنے کا جمہوری ترقی پر اثر اکثر منفی ہوتا ہے۔ ان سے حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں کیونکہ حقوق کے دعوے کو بھی قومی نظریے کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ کسی نظریے سے اختلاف کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دینے کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

انتہا پسندی کیا ہے، اسکی مختلف اقسام، ہمارے زندگی پر اثرات اور ان کی روک تھام کے لیے لائحہ عمل

چوہدری راشد عمران

انتہا پسندی دراصل روّیے کا نام ہے' سوچ کا نام ہے۔ جب کوئی شخص اپنے عقیدے، مسلک، نظریہ یا کسی سوچ میں ایک حد سے آگے چلا جاتا ہے تو پھر وہ یہی چاہتا ہے کہ جس طرح وہ سوچتا ہے سبھی ویسا سوچیں، جس طرح وہ چاہتا ہے سبھی ویسا چاہیں۔ اور ویسا کروانے کے لیے وہ کسی بھی قسم کی طاقت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مثلاً جب کسی عورت کے چہرے پر تیزاب پھینکا جاتا ہے یا اس کو جلا دیا جاتا ہے تو آپ اس عمل کو کیا نام دیں گے؟ کیا یہ انتہا پسندی نہیں؟ جب آپ کے جاگیردار آپ سے شناختی کارڈ چھین لیتے ہیں اور آپ سے آپ کا ووٹ کا حق چھین لیتے ہیں اسے آپ کیا نام دیں گے؟ معاشرے میں بدامنی، فساد، بے چینی اور معاشی بدحالی کو انتہا پسندی سے قطعاً لاتعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب دنیا میں آپ کا تشخص انتہا پسند ملک کے طور پر ہوگا تو آپ کے ملک میں کوئی پیسہ کیوں لگائے گا؟ لہذا ہمیں نہ صرف اپنے گردوپیش بلکہ اپنے روّیوں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی انسان انتہا پسندانہ روّیے اپنی پیدائش کے ساتھ نہیں لاتا بلکہ وہ معاشرے سے انتہا پسندی سیکھتا ہے۔ گھروں میں والدین کی ناچاقیاں، غربت، افلاس اور جہالت انتہا پسندادانہ رویوں کے فروغ کی اہم وجوہات ہیں۔ اگر ہم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرہ ابتدائی دور میں دو قسم کے طبقات پر مشتمل تھا۔ ایک محنت کر کے کمانے والا اور دوسرا ان سے چھین کر کھانے والا۔ اسے استحصالی طبقہ کہتے ہیں۔ انہوں نے محکوموں کو کلچر و نسل اور زبان کی بنیاد پر تقسیم کیا اور ان پر حکومت کی۔ اسی طرح ہمارے حکمرانوں نے ہمیں جہادی بنایا۔ شیعہ اور سنی اختلافات کی بنیاد رکھی۔ آج ہم نے سب سے مہنگا سرمایہ ہتھیاروں کی پیداوار پر لگایا ہے۔ انسان کی زندگی کو ختم کرنے پر سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ یہ انتہا پسندی نہیں تو اور کیا ہے؟ کوئٹہ میں مذہبی بنیادوں پر کئی سو کی تعداد میں ہزارہ شیعہ افراد کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ انتہا پسندوں سے پوچھا جائے تو وہ خود کو بالکل ٹھیک قرار دیتے ہیں۔ جب تک لوگوں کو قدرتی وسائل اور یکساں تعلیم اور امن کا ماحول مہیا نہیں کیا جاتا تب تک پرامن معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ علماء کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے کیونکہ تعلیم کی آڑ میں انتہا پسندی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور انتہا پسندی کے فروغ کے لیے لاؤڈ سپیکر اور پرنٹ میڈیا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمیں انتہا پسندانہ رویوں کی حوصلہ شکنی کر کے مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دینا ہے۔

طرز فکر میں مثبت تبدیلی اور جمہوری رویوں کے فروغ کے لیے تعلیمی اداروں اور نصاب میں انسانی حقوق کی تعلیم کی شمولیت کی اہمیت

قدّافی بھٹی

طرز فکر سے مراد سوچ کا دھارا ہے۔ سوچ کا دھارا انفرادی سوچ سے نکل کر اجتماعی بن جاتا ہے۔ اگر سوچ اجتماعی بن جائے تو یہ ممکن ہے کہ یہ منزل کا رُخ اختیار کر لے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اس میں اس کے میلانات، رجحانات، خواہشات، نفسیات اور ضروریات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ انسان کا مقام بہت پہلے سے واضح ہے۔ اسے اشرف المخلوقات کا نام دیا گیا ہے۔ اب قابل وضاحت بات یہ ہے کہ انسان کب سوچتا ہے؟ کیوں سوچتا ہے اور کس طرح سوچتا ہے؟ اور اسکی سوچ کے محرکات کیا ہوتے ہیں؟ یہی وہ محرکات ہوتے ہیں جو سوچ کو تعمیری اور تخریبی بناتے ہیں۔ ان محرکات میں لوگوں کی ضروریات، معاشرہ، طرز زندگی، تربیت، ادارے اور اقدار شامل ہیں۔ اس لیے اگر سوچ انفرادی کی بجائے اجتماعی ہو تو قوم کی فلاح ممکن ہوگی۔ جہاں تک جمہوری روّیوں کی بات ہے تو انسان اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے میں آزاد ہوتا ہے۔ جمہوریت کا تصور حقوق کی حفاظت سے لیکر صلاحیتوں کے ماننے تک ہے۔ اب حقیقی جمہوریت کی تعریف یہ ہوئی کہ انسان کو اس کا جائز مرتبہ اور مقام مل جائے اور اس کے تمام حقوق پورے ہوں۔ وہ آزاد ہو اور اپنی زندگی آرام وسکون سے گزارنے کا اسے پورا پورا حق ہو۔ جمہوری رویہ یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کی رائے کو ترجیح دے اور اپنی خامیاں نہ چھپائے۔

نصاب کی تعریف یہ ہے کہ استاد کی تربیت اور شاگرد کی تعلیم، ادارے کے اندر کی سرگرمیوں کو نصاب کہا جاتا ہے۔ کتابوں میں سے پڑھایا جانے والا سبق بھی نصاب ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شروع سے ہی بچوں کو انسانی حقوق کی تعلیم نہ صرف کتابوں میں سے دی جائے بلکہ اس کے عملی مظاہرے کے ذریعے بھی تدریس کی جائے۔ اس سے ان کو اپنے حقوق و فرائض کے بارے میں علم ہوگا اور وہ ایک پرامن شہری بن کر معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرینگے۔

انتہا پسندی انسانی ذہن میں پھلنے پھولنے والی منفی سوچ کا نام ہے جو مختلف شکلوں سے ابھر کر سامنے آتی ہے اور جب یہ عمل انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو انتہا پسندی کہلاتا ہے۔ اس میں بعض دفعہ انتہا پسند ذہنیت رکھنے والا انسان جنونی بن جاتا ہے اور اپنی سوچ منوانے کے لیے کسی بھی حد تک جاتا ہے۔ اب اگر بات طرز فکر یا اس میں مثبت تبدیلی کی ہو تو یہ ایک صبر آزما مرحلہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں یا اپنی سوچ مثبت رکھتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ انفرادی سوچ رکھتے ہیں یعنی صرف اپنے نفع نقصان کی سوچتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری جمہوری اقدار اور روّیوں کو دھچکا لگتا ہے اور معاشرے میں ناانصافی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنی سوچ کو اجتماعی سوچ بنائیں اور اپنے رویوں میں مثبت تبدیلی لائیں تو بعید نہیں کہ ہمارا معاشرہ ایک بہت بڑے انتشار سے بچ جائے۔ اس کے علاوہ اگر ہم اپنے نصاب میں تبدیلی کر لیں

> کوئی بھی انسان انتہا پسندانہ روّیے اپنی پیدائش کے ساتھ نہیں لاتا بلکہ وہ معاشرے سے انتہا پسندی سیکھتا ہے۔ گھروں میں والدین کی ناچاقیاں، غربت، افلاس اور جہالت انتہا پسندادانہ رویوں کے فروغ کی اہم وجوہات ہیں۔ اگر ہم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرہ ابتدائی دور میں دو قسم کے طبقات پر مشتمل تھا۔ ایک محنت کر کے کمانے والا اور دوسرا ان سے چھین کر کھانے والا۔ اسے استحصالی طبقہ کہتے ہیں۔ انہوں نے محکوموں کو کلچر و نسل اور زبان کی بنیاد پر تقسیم کیا اور ان پر حکومت کی۔ اسی طرح ہمارے حکمرانوں نے ہمیں جہادی بنایا۔ شیعہ اور سنی اختلافات کی بنیاد رکھی۔ آج ہم نے سب سے مہنگا سرمایہ ہتھیاروں کی پیداوار پر لگایا ہے۔ انسان کی زندگی کو ختم کرنے پر سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔

اور انتہا پسندی پر مبنی مواد ہٹا کر امن اور آشتی کا درس شامل کریں اور بنیاد ہی سے انسانی حقوق کی تعلیم اس میں شامل کریں تو ہمارے بچوں کی شروع سے ذہنیت مثبت اور پر امن بنے گی۔ ہمیں اپنی فرسودہ روایات کو بھلانا ہوگا جو کہ امن اور ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

انتہا پسندی کے انسداد افروغ میں میڈیا کا کردار اور ذرائع ابلاغ سے منسلک افراد کی تربیت کی اہمیت

حفیظ بزدار

لفظ میڈیا میڈیم سے نکلا ہے یعنی ہر وہ ذریعہ جس سے خبر دوسروں تک پہنچے میڈیا کہلاتا ہے۔ یہ قوم کا بطور معلم، تربیت کار، ناصح ہوتا ہے۔ یہ بہت جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ ضمیر کو جگاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی تقلید کرتے ہیں۔ میڈیا کی تین اقسام ہیں: ریاستی میڈیا، نجی میڈیا اور متبادل میڈیا۔

ریاستی میڈیا اقتدار کی حامل حکومت کی کامیابیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ جو عوام کو حکومت کی طرف سے ہر طرف خوشحالی کا احساس دلائے۔ نجی میڈیا فرد یا گروہ کا ذاتی کاروبار ہوتا ہے۔ نجی میڈیا میں سرمایہ کار اپنا پیسہ لگاتے ہیں اور اس سے منافع کماتے ہیں۔ اگر پاکستانی نیوز چینل کو دیکھیں تو ان کا مرکز نگاہ ملک کے سیاستدان یا ملک میں ہونے والے جرائم ہوتے ہیں۔ یہ چینلز سیاستدانوں کے الفاظ اور عوامی مجرمانہ معاملات کو بیچتے ہیں جس کے بدلے ان کو اشتہارات ملتے ہیں اور ان کی ریٹنگ ٹیلی ویژن ریٹنگ پوائنٹ سے پرکھی جاتی ہے۔ نجی میڈیا تین چیزوں کو اہمیت دیتا ہے معیشت (اشتہارات اور ڈونرز کو ٹی آر پی سے پرکھا جاتا ہے)، ساخت (پیشہ ور لوگوں کا گروہ جو ایک تصور کو ابھارنے کے لیے خام مواد کو ٹھوس شکل دیتا ہے) اور حکمت عملی (جس کے تحت ٹی چینل مواد کو پسند یا ناپسند کرتا ہے یا اس میں تبدیلی لاتا ہے)۔ ہمارا میڈیا شدت پسندی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس کی خود غرض حکمت عملیاں ہیں تا کہ یہ زیادہ سے زیادہ منافع کمائے۔ یہ ممنوعہ پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔ بسا اوقات یہ شدت پسندی کی بنیادی وجہ بھی بنتا ہے اور عوام کو شعور اور آگاہی سے محروم رکھتا ہے۔ ہمارا اینکر ہر موضوع پر ہر فن مولا ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ جب چاہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ خارجہ پالیسی پر بلا تکان بات چیت کرتے ہیں۔ سیاسی گالی گلوچ ایک عام سی بات ہے۔ اینکر زخود ہی مسئلے بیان کرتے ہیں اور مسئلے کا حل بھی خود ہی کر لیتے ہیں جو ان کا کردار نہیں۔ اینکر رپورٹر اور کالم نویس بن کر اپنے آپ کو حرف کل سمجھتا ہے۔ آج میڈیا کی ترقی نے دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ اس لئے میڈیا کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بننا چاہئے۔ خبر کو سچائی کے ساتھ عوام تک پہنچانا چاہئے۔ ضروری ہے کہ رپوٹر دیانتدار اور غیر جانبدار ہو اور یہ ادراک رکھے کہ کرنا کیا ہے۔ حقیقت پسندی، خبر کو خبر رکھنا بریکنگ نیوز نہ بنانا اور علم وقانون سے آگاہی کے علاوہ اینکر کو خوشگوار طبیعت کا ہونا چاہے۔

میڈیا میں گیٹ کیپر اور پیمپرا کا کردار بہت اہم ہے۔

> جمہوریت، انسانی حقوق اور قانون ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے۔ جمہوریت یہ ہے کہ تمام لوگ آزادی سے رہ سکیں اور اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ جمہوریت ایک لائحہ عمل ہے۔ آپ دوسروں کی رائے کو ماننے کا حوصلہ پیدا کریں اور ان کی رائے کو خود سے بہتر سمجھیں۔ رائے عامہ کے ذریعے جمہوریت کا اظہار نہیں ہوگا تو آئین نہیں بنے گا۔ جمہوریت اور انسانی حقوق لازم وملزم ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ایک ایسے جمہوری سیاسی نظام کا تصور کرنا ممکن نہیں جو اپنے شہریوں کے شہری وسیاسی حقوق کو یقینی نہ بنائے۔ جمہوری نظام میں انسانی حقوق کو خاص مقام حاصل ہے۔ اور معاشی ترقی عوام کی شرکت سے ہی ممکن ہے۔

گیٹ کیپر ایک ایسے عہدہ کا نام ہے جسکا کام ایسی تمام خبروں کو روکنا ہے جس سے معاشرے میں بدامنی یا انتشار پھیلنے کا خدشہ ہو۔ میڈیا ہماری ریاست کا ایک مضبوط ستون ہے۔ اگر میڈیا دیانتداری سے اپنا کردار ادا کرے تو پاکستان کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ میڈیا سے منسلک افرد کی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق، انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے مابین تعلق

عابد حفیظ

جمہوریت، انسانی حقوق اور قانون ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے۔ جمہوریت یہ ہے کہ تمام لوگ آزادی سے رہ سکیں اور اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ جمہوریت ایک لائحہ عمل ہے۔ آپ دوسروں کی رائے کو ماننے کا حوصلہ پیدا کریں اور ان کی رائے کو خود سے بہتر سمجھیں۔ رائے عامہ کے ذریعے جمہوریت کا اظہار نہیں ہوگا تو آئین نہیں بنے گا۔ جمہوریت اور انسانی حقوق لازم وملزم ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ایک ایسے جمہوری سیاسی نظام کا تصور کرنا ممکن نہیں جو اپنے شہریوں کے شہری وسیاسی حقوق کو یقینی نہ بنائے۔ جمہوری نظام میں انسانی حقوق کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ جمہوریت میں معاشی ترقی عوام کی شرکت سے ہی ممکن ہے۔ جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں ریاست کے تمام بالغ افراد جنہیں اس ریاست کی شہریت حاصل ہو، انفرادی طور پر اپنی رائے کے ذریعہ ایسے افراد کا چناؤ کرتے ہیں جو کہ ایک مقررہ حد تک ان کی ریاست کا انتظام سنبھال سکیں۔ جمہوریت کوئی نئی اصطلاح نہیں ہے۔ قدیم یونان میں اس کا ابتدائی تجربہ ہوا جب غلاموں نے بادشاہ کے اختیارات کے خلاف تنظیمیں بنائیں اور اپنے حقوق کی آواز بلند کی۔ قدیم روم میں بھی جمہوریت کے آثار ملتے ہیں لیکن یہ بہت مختصر سا عمل تھا۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی جمہوری طرز حکومت سامنے آتا ہے اور یہ ایسا نظام حکومت تھا جس میں عوام اپنے حقوق کی ضمانت چاہتے تھے۔ ایک بہتر جمہوری نظام کی چند خوبیاں درج ذیل ہیں مثلاً ہر شہری کے بنیادی انسانی حقوق اور وسائل کی فراہمی کا تحفظ، آزادی رائے کو یقینی بنانا اور ہر شہری کی انفرادیت کو تسلیم کرنا، معاشرتی عدم برداشت کا خاتمہ اور رواداری کا فروغ، قانون کی عملداری اور بہتر اطلاق اور تمام حقائق اور معلومات تک ہر شہری کی رسائی یقینی بنانا۔ مناسب رہائش، تعلیم، صحت اور روزگار سمیت زندگی کی دیگر بنیادی ضروریات بنیادی حقوق ہیں۔ جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے ان بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ افراد مل کر گروہوں اور ریاست کو تشکیل دیتے ہیں اور ان افراد کی جسمانی وذہنی صحت کی بہتر نشوونما کسی بھی جمہوری ریاست کا اولین فرض ہے۔ صاف پانی کی فراہمی، اسپتالوں کا قیام، عملہ کی تربیت، تعلیم کے لیے مناسب تعداد میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام بہتر نصاب کی تشکیل اور بغیر کسی نسلی، مذہبی اور گروہی تفریق کے ریاست کے ہر فرد تک ان کی ترسیل ریاستی فرائض میں شامل ہے۔ استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ کیے بغیر معاشرتی مساوات کا قیام ناممکن ہے۔ مرد وخواتین کے درمیان تفریق وامتیاز ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ خواتین انسانی معاشروں میں ایک طویل عرصے تک دوسرے درجے کی شہری سمجھی جاتی رہی ہیں اور معاشرہ انہیں کم مراعات فراہم کرتا تھا۔ اور جدید جمہوریت جسے لبرل جمہوریت بھی کہا جاتا ہے اس امتیاز وتفریق کے خاتمے کے لیے قابل قدر فیصلے کر چکی ہے۔ ہماری ریاست کو بھی خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنا چاہئے۔

قمبر/شہدادکوٹ 30-29 جولائی

ورکشاپ کے اغراض ومقاصد

جمیلہ منگی

اس ورکشاپ میں شرکت کرنے پر ایچ آر سی پی آپ سب کا شکر گزار ہے۔اس ورکشاپ کا مقصد پاکستان کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرنا ہے تاکہ ان مسائل کا ممکنہ حل تلاش کیا جاسکے۔اس وقت پاکستان کو درپیش سب سے سنگین مسئلہ انتہاپسندی ہے جو دیمک کی طرح ہمارے ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ایچ آر سی پی نے پاکستان کے مختلف اضلاع اور تحصیلوں میں ورکشاپ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ تیزی سے بڑھتی ہوئی انتہاپسندی کے اثرات سے بچا جا سکے۔

ہمیں اس وقت رواداری اور برداشت جیسے تصورات کو فروغ دینا چاہیے اور روشن خیال معاشرہ پیدا کرنا چاہیے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق،انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے مابین تعلق

محمد نواز سومرو

جمہوریت کا لفظ یونانی زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے عوام کی حکومت۔جمہوریت ایسے نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں عوام کو مذہبی،اقتصادی اور سیاسی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے۔اور ہر انسان کے تمام بنیادی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے۔جمہوریت اور انسانی حقوق لازم وملزوم ہیں۔جو حقوق ہمیں آئین میں ملے ہیں ان میں زندہ رہنے کا حق،اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق،ظلم یا ذلت سے چھٹکارے کا حق ، تقریر وتحریر کی آزادی کا حق شامل ہیں۔ایک جمہوری حکومت میں انسانی حقوق کی پاسداری مکمل طور پر نہ ہو تو ہم اسے جمہوریت نہیں کہیں گے۔پاکستان میں جمہوریت اس لیے نہیں آسکی کہ یہاں ساٹھ سال میں سے چونتیس سال فوج نے براہ راست حکومت کی ہے۔جہاں انسانی حقوق کی پامالی ہوگی وہاں معاشی ترقی ناممکن ہے۔

انتہاپسندی کے انسداد میں ادب،ادیب اور فنونِ لطیفہ کا کردار

ریاضت حسین

انتہاپسندی ایک ذہنی روّیہ ہے جو مسئلوں کے غیر منطقی حل پر زور دیتا ہے۔انتہاپسندی ایک عمل ہے ایک سوچ ہے جو ہم دوسروں پر مسلط کرتے ہیں جس سے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر برا اثر پڑتا ہے۔ادب کی اصطلاح فن کے ایک مقبول شعبے کے متعلق ہے جس میں مجلسی آداب،مہمان نوازی،تعلیم اور زبان دانی کے مفاہیم شامل ہیں۔ادیب کا انتہاپسندی کے خاتمے میں بڑا کردار ہوسکتا ہے کیونکہ ادیب ایک ترتیب اور طریقہ بتاتا ہے۔فنونِ لطیفہ میں فلم،فوٹوگرافی، میوزک اور مصوری شامل ہیں۔فنونِ لطیفہ کے ذریعے ہم انتہاپسندانہ سوچ کو کم کرسکتے ہیں۔فنونِ لطیفہ اندرونی کیفیت کو بدل دیتے ہیں۔شاعروں اور دانشوروں میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔وہ بہت نرمی اور مٹھاس سے انسانی فطرت کی ایک سیدھے راستے پر رہنمائی کرسکتے ہیں۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ رنگوں میں نکھار لاتے ہیں۔شاعر، موسیقار، خطاط اور مصور زندگی اور معاشرے میں امید اور رنگ پیدا کرتے ہیں۔یہ تمام چیزیں رواداری کے فروغ میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔

مذہبی ومسلکی ہم آہنگی اور رواداری کا فروغ اور نفرت و تعصب کے انسداد کیلیے حکمت عملی

خادم حسین رند

ہمیں اپنے مذہبی عقیدے کے مقابلے میں دوسرے عقیدے کے لوگوں کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ آئین مذہبی عقیدے کی آزادی،اظہار رائے کی آزادی،مذہبی اجتماع کی آزادی اور مذہبی رسومات کی آزادی دیتا ہے۔لیکن یہ چیزیں ہمارے معاشرے میں قبول نہیں کی جارہیں۔جس شخص میں رواداری ہوگی وہ انسان کے بنیادی حقوق کا محافظ ہوگا۔دنیا بھر میں چار سو سے زیادہ مذاہب ہیں لیکن ان میں سے زیادہ ما نے جانے والے مذاہب میں اسلام،ہندومت،مسیحت اور بدھ مت شامل ہیں۔عدم رواداری کی وجہ سے ہمارا سارا ملک مذہبی انتہاپسندی کا شکار ہے۔پاکستان میں بہت سارے لوگ مذہب کے نام پر قتل کئے گئے ہیں۔انتہا پسندی کا آغاز ضیاء الحق کے دور سے ہوا ہے جس میں ایک فرقے کو پروان چڑھایا گیا تھا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ 31-30 جولائی 2015

ورکشاپ کے اغراض ومقاصد

عون محمد

پاکستان کو آج کل بین الاقوامی سطح پر شدید تنقید کا سامنا ہے اور اس کی وجہ تیزی سے بڑھتی ہوئی انتہا پسندی ہے۔کچھ مخصوص گروہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے انتہاپسندی کے فروغ میں سرگرم عمل ہیں۔انتہاپسندی کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے راہ تلاش کررہا ہے۔اس ورکشاپ کا مقصد ضلع اور تحصیل کی سطح پر انتہا پسندی کی اقسام،وجوہات،اس کے انفرادی واجتماعی زندگی پر اثرات سے متعارف کروانا ہے اور انتہاپسندی سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ سب کو تربیت فراہم کرنا ہے تاکہ عوام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کی مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے میں معاونت کی جاسکے۔دہشت گردی،خودکش حملوں اور مذہبی اختلافات نے ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کردیا ہے اور بے روزگاری،بے انصافی،تعلیم اور صحت کے وسائل کی کمی نے پاکستان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ انہی مسائل نے انتہا پسندی کے پنپنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔علاوہ ازیں ورکشاپ کا مقصد انتہا پسندی کی دیگر اقسام مثلاً سماجی انتہا پسندی،سیاسی انتہا پسندی قبائلی ونسلی انتہا پسندی وغیرہ پر بھی روشنی ڈالنا ہے۔رسم ورواج کے نام پر انسانی حقوق کی پامالی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنا بھی ہمارا مقصد ہے۔اس لیے ہم نے آپ لوگوں کو دعوت دی ہے کہ ان امراض پر قابو پانے کے لیے تدابیر تلاش کی جاسکیں اور انسانی حقوق کے فروغ کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے ممکنہ اقدامات کئے جاسکیں۔یہی مناسب وقت ہے کہ ہمیں انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے مل کر کام کرنا ہوگا۔آیئے ہمارے ساتھ قدم بڑھایئے اور اس مہلک مرض سے نجات کی کوشش میں شامل ہوجائیں تاکہ اپنے ملک کو بچانے کے لیے ہر فرد اپنا انفرادی کردار ادا کرسکے۔

انسانی حقوق کے فروغ،حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے حکمت عملی کی تشکیل اور عوام تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار

حفیظ بزدار

ہمارے بہت سے حقوق ہیں مثلاً معاشرتی حق،آزادی کا حق،معاشی حق اور اِس طرح کے اور بہت سے حقوق ہیں جو ریاست پر ہماری طرف سے لاگو ہیں۔جہاں تک بات ہے جمہوریت کی تو جمہوریت ایک فلسفہ ہے۔حکومت تو آتی جاتی رہتی ہے لیکن جمہوریت قائم رہتی ہے چاہے عملی طور پر برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔ریاست عوام سے ٹیکس لیتی ہے۔اس کے بدلے میں حکومت عوام کو ان کے حقوق اور سہولیات مہیا کرتی ہے۔جب ریاست عوام سے ٹیکس لیتی ہے تو یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اُن کے حقوق دے۔اِسی طرح اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو 1939ء سے 1945ء تک جاری رہنے والی دوسری جنگ عظیم میں چھ کروڑ لوگ مارے گئے تھے اسلئے اس صورت حال کے پیش نظر UDHR معرض وجود میں آیا جس پر تمام ممبران نے 1948ء میں دستخط کئے تاکہ ایسی خونریز جنگوں کا سدباب کیا جاسکے اور انسانی حقوق کو پامال ہونے سے بچایا جاسکے۔انسانی

حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ لوگوں میں ان کے حقوق کے حوالے سے شعور اور آگاہی پیدا ہو۔ سب کے حقوق یکساں ہیں چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا عدالتی نظام ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ جس ادارے سے ہمیں اپنے حق کے بارے میں کچھ پوچھنا ہوتا ہے وہ ہمیں معلومات فراہم نہیں کرتا اور اس سے ہمارے حقوق غصب ہوتے ہیں کیونکہ اکثر اس ادارے تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ان اداروں تک رسائی آسان بنائی جائے اور اس میں سول سوسائٹی ایک اہم کردار کی حامل ہے۔ مناسب ہوگا کہ عدالتی نظام کو بہتر بنایا جائے اور برابری کی بنیاد پر سب کو حقوق دیئے جائیں۔

ہماری سوچ کی بنیاد ہمارے خاندان سے شروع ہوتی ہے جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہم ہمارے آس پاس ہونے والے عوامل کو آہستہ آہستہ اپنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طرز فکر میں تبدیلی کا پہلا سبب خاندان ہے۔ دُنیا میں ہزاروں زُبانیں بولی جاتی ہیں جو کہ حالات و واقعات اور ضروریات کی پیش نظر

ہماری سوچ کی بنیاد ہمارے خاندان سے شروع ہوتی ہے جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہم ہمارے آس پاس ہونے والے عوامل کو آہستہ آہستہ اپنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طرز فکر میں تبدیلی کا پہلا سبب خاندان ہے۔ دُنیا میں ہزاروں زُبانیں بولی جاتی ہیں جو کہ حالات و واقعات اور ضروریات کی پیش نظر سامنے آئیں۔
لیکن آج ہر زبان کی اپنی الگ پہچان ہے۔ اس طرح مذاہب بھی مختلف ہیں اور ہر کسی کو ایک دوسرے کے عقیدے اور ایمان کی عزت کرنی چاہیئے۔

سامنے آئیں۔ لیکن آج ہر زبان کی اپنی الگ پہچان ہے۔ اِس طرح مذاہب بھی مختلف ہیں اور ہر کسی کو ایک دوسرے کے عقیدے اور ایمان کی عزت کرنی چاہیئے۔ قرآن پاک میں کہیں بھی رب المسلمین نہیں لکھا گیا بلکہ رب العلمین لکھا گیا ہے اور یہی ہمارا جمہوری رویہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کریں۔ جب ہم جمہوریت جمہوریت کی آواز لگاتے ہیں تو پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے کہ کیا ہمارے روّیے اور ہمارے گھروں میں جمہوریت ہے؟ اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہمارے اندر جمہوری روّیے نہیں ہیں اور کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں جو جمہوری روّیوں کے فروغ کے لیے کام کرتا ہو۔ ہماری سوچ میں تبدیلی کے لیے ہماری کمیونٹی بھی کارفرما ہوتی ہے اور کمیونٹی میں ہماری درسگاہیں اور سکول بھی شامل ہیں۔ اور ہمارے سکولوں میں جو نصاب ہمیں پڑھایا جاتا ہے اُس سے ہماری سوچ کی مزید ترقی ہوتی ہے لیکن وہ مثبت ہے یا منفی یہ نصاب پر منحصر ہے۔ ہمارے ملک پاکستان کے آئین میں بھی انسانی حقوق شامل ہیں لیکن جب تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں کہ ہمارے حقوق کیا ہیں اور ہم کس سے وہ حقوق مانگ سکتے ہیں؟ کون ہمارے حقوق دینے کا مجاز ہے؟ اُس وقت تک ہمارے حقوق کا حصول ناممکن ہے۔ ہماری درسگاہوں اور سکولوں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں انسانی حقوق کی تعلیمات کا کہیں بھی ذکر نہیں جبکہ یورپین ممالک میں پانچویں جماعت تک طالب علموں کو اُن کے بنیادی حقوق کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہماری سوچ میں مثبت تبدیلی کے لیے ہمیں بنیادی انسانی حقوق کا پتہ ہونا بہت لازم ہے اور اِس کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم کا عام ہونا بہت ضروری ہے۔ لوگوں کو یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ حق کیا ہوتا ہے اور اُسے کیسے اور کہاں سے حاصل کرنا ہے۔ اِس کے لیے ریاست کا کردار مثبت ہونا بہت ضروری ہے۔

مذہبی ہم آہنگی اور رواداری وقت کی اہم ضرورت ہے

غضنفر امین

11 اگست 1947ء کی قائد اعظم کی تقریر میں قائداعظم نے پاکستان کی پوری آئیڈیالوجی کو سامنے رکھ دیا اور پاکستان کے لئے رہنما اصول متعین کر دیا تھا۔ لیکن اس تقریر کو قوم سے چھپایا گیا اور نصاب سے نکال دیا گیا کیونکہ بعض لوگ قائد کا پاکستان نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی کے سپیکر جوگندر ناتھ منڈل تھے اور 12 سے زائد ہندو اس اسمبلی میں پاکستان کی حمایت میں موجود تھے اور 1949ء تک متحرک رہے جب تک قرارداد مقاصد منظور نہیں ہوئی۔ قرارداد مقاصد کے ذریعے کچھ ایسی چیزیں پاکستان کی نظریاتی ساخت میں شامل کر دی گئیں جو قائد کی 11 اگست والی تقریر کے خلاف تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ پاکستان سے مایوس ہوگئے اور مذہبی رواداری ختم ہوگئی۔ پاکستان کے قیام کے وقت ملک میں 25% اقلیتیں موجود تھیں جن میں 25000 ہزار یہودی بھی تھے مگر اب ایک بھی یہودی موجود نہیں ہے۔ پاکستان بنانے میں شریک اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہیں جبکہ ایس پی سنگا سپیکر پنجاب اسمبلی نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ 88-1977ء کے مارشل لاء دور میں بہت سے مذہبی، نسلی اور علاقائی مسائل نے جنم لیا۔ 1971ء میں گورنمنٹ نے تمام پرائیویٹ اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ملک میں موجود اقلیتوں کے تمام ملکیتی ادارے گورنمنٹ کنٹرول میں چلے گئے جس سے ان میں اپنے اثاثہ جات کے غیر محفوظ ہونے کا احساس بھی ابھر کر سامنے آیا۔ ان میں بعض ادارے واپس ملے تو وہ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ 1985ء میں اسرائیل میں چند گروپوں نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کے ردعمل میں پاکستان میں چرچ پر حملہ ہوا۔ بے بنیاد الزامات لگا کر شانتی نگر میں مسیحوں کی بستی پر حملہ کیا گیا اور اسے صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ پر امن معاشرے کے قیام کے لئے انصاف کے تین اہم جزو

پاکستان کے قیام کے وقت ملک میں 25% اقلیتیں موجود تھیں جن میں 25000 ہزار یہودی بھی تھے مگر اب ایک بھی یہودی موجود نہیں ہے۔ پاکستان بنانے میں شریک اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہیں جبکہ ایس پی سنگا سپیکر پنجاب اسمبلی نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ 88-1977ء کے مارشل لاء دور میں بہت سے مذہبی، نسلی اور علاقائی مسائل نے جنم لیا۔ 1971ء میں گورنمنٹ نے تمام پرائیویٹ اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ملک میں موجود اقلیتوں کے تمام ملکیتی ادارے گورنمنٹ کنٹرول میں چلے گئے جس سے ان میں اپنے اثاثہ جات کے غیر محفوظ ہونے کا احساس بھی ابھر کر سامنے آیا۔

ہیں؛ بنیادی حقوق، سچائی اور معقولیت۔ کیونکہ ہر شخص کیلئے بنیادی حقوق کی پاسداری اور تحفظ ضروری ہے اور امن کی پامالی دراصل ناانصافی ہے۔ انصاف کے حصول کے لئے سچائی اور معقولیت کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ انصاف پر مبنی خوشحال معاشرہ کے لئے پر امن حالات کو پیدا اور برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو وہ انسان ہوتا۔ مذہب کے لبادے بعد میں پہنتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس وقت کافر ہونے کے فتوے تو لگاتا ہے لیکن انسان ہونے کی توقیر کا خیال نہیں کر رہا۔ امن کی فضا میں آپ دیگر لوگوں سے مکالمہ کریں گے تو آپ کو ان کی خوبیوں کا اندازا ہوگا۔ جنگ کی حالت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کے اندر محبت، عقل اور دانش کا اس وقت پتا چل سکتا ہے۔ جب امن ہو امن دل سے محسوس کی جانے والی چیز ہے۔ اگر دل امن کا احساس دے تو سمجھو امن ہے ورنہ نہیں۔ تمام مذاہب نے امن کی تعلیم دی ہے لہذا انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والوں کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انتہا پسندی کے خاتمہ اور مذہبی، مسلکی تعصّبات کے خاتمہ میں اپنا کردار ادا کریں۔

اس سلسلہ میں ایک سلائیڈ کی مدد سے امن ومصالحت کے مختلف طریقوں کی وضاحت کی گئی جن میں قیام امن بذریعہ ابلاغ عامہ اور مؤثر رابطہ، قیام امن بذریعہ ترقیاتی شعبہ جات اور بحالی، قیام امن بذریعہ تبادلہ وفود (یوتھ، خواتین، سٹوڈنٹس، سٹڈی گروپس، اور مشترکہ سرگرمیاں)، قیام امن بذریعہ پیروکاری عدم تشدد، شہریوں کی مشترکہ جدوجہد، قیام امن بذریعہ تحقیق، قیام امن بذریعہ بین المذاہب مکالمہ اور قیام امن بذریعہ سہل کاری، مثبت مکالمہ اور ثالثی کردار شامل تھے۔

طرز فکر میں مثبت تبدیلی اور جمہوری رویوں کے فروغ کے لیے تعلیمی اداروں اور نصاب میں انسانی حقوق کی تعلیم کی شمولیت کی اہمیت

یٰسین پرواز

پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ انتہا پسندی کیا ہے؟ انتہا پسندی بنیادی طور پر کسی عمل، سوچ، رویے، عقیدے میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک گلاس میں پانی ڈالا جائے اور پانی گلاس میں بھرنے کے بعد نیچے بہتا رہے تو وہ پانی کا نقصان ہے۔ اسی طرح کسی بھی چیز کی کثرت نقصان دہ ہوتی ہے اور جب ہم کسی بھی عقیدے، سوچ یا روّیے میں آخری حد سے تجاوز کرنے سے بھی نہیں ڈرتے تو اس کو انتہا پسندی کہتے ہیں۔ ہماری کتب میں کچھ ایسا شرانگیز مواد موجود ہے جو انتہا پسندی کے فروغ میں اور تنگ نظر احمق پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری کئی درسی کتابیں بچوں کے نازک ذہنوں میں دوسرے فرقوں اور عقائد کے لیے تنگ نظری پیدا کرتی ہیں۔ کلاس اول سے پنجم تک تمام ''میری کتابوں'' میں مسلمانوں کو بھائی بھائی کہا گیا ہے۔ بار بار دہرائی گئی اس قسم کی باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مشترکہ عقیدہ ہی بھائی چارے کی واحد بنیاد ہے۔ کتابوں میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ تمام انسان آپس میں بھائی ہیں اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان نظر آتا ہے کہ دنیا بھر کے تمام انسان ایک واحد انسانی خاندان کے افراد ہیں۔ قطع نظر رنگ و نسل، مذہب ومسلک، زبان وثقافت۔ تیسری جماعت کے لیے نصابی کتاب طلباء کو یہ بتاتی ہے کہ تمام لوگوں نے مردوں اور عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں حتیٰ کہ بچوں نے بھی تحریک پاکستان کی حمایت کی اور ان سب کا ایک ہی نعرہ تھا ''لے کر رہیں گے پاکستان، بن کر رہے گا پاکستان''۔ ان وجوہات کی بنیاد پر کثیر الوجود اور شراکتی جمہوریت بین المذاہب یکجہتی اور انسانی حقوق کی اقدار کو فروغ دینے کے لیے نصابی کتب میں نظر ثانی کے کام میں اگر کوئی تاخیر کی جاتی ہے تو ریاست پر الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ وہ دانستہ طور پر ملک میں مذہبی انتہا پسندی کی راہیں استوار کر رہی ہے۔ تعلیم ایک طرف تو نئی ثقافت کو جنم دیتی ہے اور دوسری طرف قدیم ثقافت میں موجود متروک اقدار سے نجات بھی حاصل کرتی ہے۔ تعلیمی مواد کے لیے ضروری ہے کہ وہ نامیاتی اکائی کی طرح ہو اور اس میں زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود رہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرتی ماحول میں ہونیوالی پیش رفتوں کو نصاب کا حصہ بنایا جاتا رہے۔ ہمارا نصاب اس معیار پر پورا نہیں ہوتا مطلب یہ کہ

> پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ انتہا پسندی کیا ہے؟ انتہا پسندی بنیادی طور پر کسی عمل، سوچ، رویے، عقیدے میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک گلاس میں پانی ڈالا جائے اور پانی گلاس میں بھرنے کے بعد نیچے بہتا رہے تو وہ پانی کا نقصان ہے۔ اسی طرح کسی بھی چیز کی کثرت نقصان دہ ہوتی ہے اور جب ہم کسی بھی عقیدے، سوچ یا روّیے میں جائز حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو اس کو انتہا پسندی کہتے ہیں۔ ہماری کتب میں کچھ ایسا شرانگیز مواد موجود ہے جو انتہا پسندی کے فروغ میں اور تنگ نظر احمق پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری کئی درسی کتابیں بچوں کے نازک ذہنوں میں دوسرے فرقوں اور عقائد کے لیے تنگ نظری پیدا کرتی ہیں۔

ہماری تعلیم میں جدّت نہیں ہے۔ نصابی کتابیں طلباء میں غیر مسلموں اور چھوٹے مسلم فرقوں کے خلاف تعصب کو پروان چڑھا رہی ہیں۔ ایک طرف تو اقلیتوں کی ملک کے لیے خدمات کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا جبکہ دوسری طرف ان کے متعلق حقارت آمیز اقتباسات درج ہیں۔ صنفی مساوات کے فروغ میں ہمارا تعلیمی نظام ناکام ہے۔ ہمارا نصاب عورتوں اور مردوں کے جنسی امتیاز کی عکاسی کرتا ہے۔ عورتوں کو صرف گھریلو کردار ادا کرنے والی جنس کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ سماج میں ان کی ترقی کے متعلق مواد موجود نہیں۔ انسانی حقوق کیا ہیں، اس حوالے سے حکومت پر عائد فرائض اور انسانی حقوق کی تحریک میں قومی وبین الاقوامی جہدوجہد کو اجاگر کرنے سے پہلوتہی کی گئی ہے۔ شہریوں میں ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے قیام کی خواہش پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ ہم آہنگی، باہمی تعاون اور بھائی چارے کی فضا قائم کی جائے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر بچے سکول نہیں جاتے اور جو سکول جاتے ہیں وہ ایسا کچھ بھی نہیں سیکھتے جس کی بناء پر وہ بہتر شہری بن سکیں۔ سکولوں کو بذات خود مسئلہ بننے کی بجائے مسئلے کے حل کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ سکول مناسب طور پر تعلیم فراہم نہیں کر رہے اور نہ ہی طالبعلموں کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ معیاری تعلیم کا مطلب تو یہ ہے کہ طالبعلم جمہوری اور اخلاقی اقدار کی جانب راغب ہوں، بنیادی انسانی حقوق سے آگاہی حاصل ہو ان کے ذہن میں نئے خیالات پیدا ہوں۔ تعلیم پچھلی حکومتوں کی ترجیح تو کبھی نہیں رہی اور اب بھی تعلیم کے لیے وقف کردہ بجٹ 3 فیصد سے کم ہے۔

انتہا پسندی کیا ہے، اسکی مختلف اقسام، ہمارے زندگی پر اثرات اور ان کی روک تھام کے لیے لائحہ عمل

ذکی نقوی

عمومی طور پر جب ہم انتہا پسندی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں فوراً مذہبی انتہا پسندی کا نام آتا ہے اور ایسا ہونا اس لیے بھی فطری ہے کہ معاشرتی سطح پر ہم اس کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔ انتہا پسندی کی باقی اقسام میں سماجی انتہا پسندی، سیاسی انتہا پسندی اور ریاستی انتہا پسندی شامل ہیں۔

مذہبی انتہا پسندی: اس کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ عقیدے کی بنیاد پر انسانوں کی برتری اور کمتری کا تعین کرنا اور اسی عقیدے کی رو سے ان سے حسن سلوک کرنا۔ یہ ایک طرح سے انتہا پسندی کی سب سے خطرناک قسم ہے کیونکہ انسانی تاریخ میں لوگ سب سے زیادہ اسی وجہ سے غیر انسانی سلوک کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے کہ آپ اپنے عقیدے کو برحق سمجھیں لیکن کسی کے عقیدے کو بزور طاقت تبدیل کرنا درست نہیں۔ مختصراً عقیدے کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کرنا اور اپنے عقائد کو بزور طاقت دوسروں پر مسلط کرنا مذہبی انتہا پسندی کہلاتا ہے۔

سماجی انتہا پسندی: ہم سب اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں اس کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں۔ سماجی روّیوں اور ضابطوں میں کسی بھی صورت انتہا پر چلے جانا سماجی انتہا پسندی کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سماج میں بچیوں کا رشتہ طے کرتے وقت ان کی مرضی کو شامل نہ کرنا ایک عام رواج ہے جس کا عمومی جواز یہ دیا جاتا ہے کہ والدین آخر اپنی اولاد کا برا تو نہیں چاہیں گے۔ لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ والدین جو فیصلہ کریں گے وہ ٹھیک ہی ہوگا؟ اسی طرح آپ اپنی بچی کا ایک قانونی، آئینی اور مذہبی حق چھین رہے ہیں اور محض رسم ورواج

کے نام پر ایک انتہا پسندانہ فیصلہ کر رہے ہیں۔

سیاسی انتہا پسندی: پاکستانی سماج میں اس کی مثالیں بھی بہت عام ہیں۔ بزور طاقت کسی کے ووٹ کا حق چھین لینا سیاسی انتہا پسندی ہے۔ ووٹ معاشرے کے ہر فرد کا جمہوری حق ہے لیکن جب کوئی ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر اس حق کو پامال کرتا ہے تو وہ سیاسی انتہا پسندی کا مرتکب ہوتا ہے۔

ریاستی انتہا پسندی: افراد، گروہوں اور قبائل کی طرح ریاستیں بھی اپنے مقاصد کے لیے انتہا پسندی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ جب کوئی ریاست کسی خاص نظریے یا عقیدے کو اپنے عوام پر مسلط کرتی ہے تو وہ اس زمرے میں آتی ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ ریاستی جبر نہیں؟ ریاست کا کردار 'ماں' جیسا ہونا چاہیے۔

انتہا پسندی خواہ کسی شکل میں ہو وہ تباہی کا موجب بنے گی۔

انتہا پسندی کے انسداد/فروغ میں میڈیا کا کردار اور ذرائع ابلاغ سے منسلک افراد کی تربیت کی اہمیت

بشارت حمید

میڈیا ایک ذریعہ ہے جس سے ہمیں علم، اطلاع اور تفریح مہیا کی جاتی ہے۔ میڈیا کی مختلف اقسام ہیں جن میں سر فہرست الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہیں، ایک نئے رجحان سے ہماری قوم متعارف ہوئی ہے جو کہ سوشل میڈیا ہے۔ سوشل میڈیا کے کچھ فوائد اور کچھ نقصانات ہیں۔ فائدہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ہر کسی کو اظہار رائے کی آزادی میسر ہے جبکہ نقصان یہ ہے کہ دہشت گرد نفرت انگیز مواد سوشل میڈیا کی ویب سائٹس پر اپ لوڈ کرتے رہتے ہیں۔ ایسی پوسٹس کی کچھ لوگ مذمت کرتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو دہشت گردوں سے ذہنی مطابقت رکھتے ہیں اس طرح کی پوسٹس سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے اردگرد کے لوگوں کی ذہن سازی شروع کر رہے ہیں۔ پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا یعنی ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن سرکاری اختیار میں ہے۔ اس نے ماضی میں ہمارے معاشرے کو مذہبی شدت پسند بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ سرکاری میڈیا نے اجارہ داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے افسوسناک کردار ادا کیا جسکا نتیجہ آج ہماری قوم سخت جانی اور مالی نقصان کی صورت میں بھگت رہی ہے۔ اس میڈیا نے ایک خاص اسلامی نقطہ نظر پیش کیا اور برسوں تک لوگوں کی ذہن سازی کی۔ حالیہ سیاسی اور عسکری کشیدگی پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے سب سے زیادہ وکالت سرکاری میڈیا کی طرف سے ہی کی گئی۔ فضل اللہ نے سوات پر قبضے کے بعد اپنی خاص مذہبی سوچ اور دہشتگردی کی تبلیغ کے لیے ایف ایم ریڈیو کا سہارا لیا۔ اس میڈیا کو فضل اللہ نے اسطرح استعمال کیا کہ سوات کے لوگ اسکی باتوں کے قائل ہو گئے اور اپنے نوجوان لڑکوں کو جہاد میں شمولیت کی دعوت دی۔ پھر جب فضل اللہ کے پیش کردہ جہاد کی اصلیت لوگوں پر آشکار ہوئی تو لوگ متنفر ہو گئے اور اس خاص سوچ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

پاکستانی نجی میڈیا جس نے حال ہی میں ایک نئی طاقت اور اہمیت حاصل کی ہے وہ بھی ابتدائی ایام سے لے کر آج تک اس سارے عمل میں ایک عامل کے طور پر موجود رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ شدت پسند گروہوں کا نشانہ بھی بنتا رہا ہے۔ نجی میڈیا نے بڑی حد تک انتہا پسندی کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ 1950ء میں حکومت پنجاب نے شدت پسندانہ خیالات کی اشاعت اور فروغ کے لئے ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا۔ اس وقت کی حکومت کے ڈائریکٹوریٹ آف انفارمیشن نے ان اخبارات کو رقوم ادا کیں جو احمدیوں کے خلاف شدت پسندانہ خیالات کی تشہیر کرتے تھے۔ یہ معاملہ ایک انکوائری کمیٹی کے روبرو پیش ہوا اور ایک اخبار کے مدیر نے اسکی توثیق کی۔ بعض اخبار طالبان اور دیگر دہشت گردوں کو عسکریت پسند کہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو باقی معاشرے سے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرتی عوامل اس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

پاکستانی نجی میڈیا جس نے حال ہی میں ایک نئی طاقت اور اہمیت حاصل کی ہے وہ بھی ابتدائی ایام سے لے کر آج تک اس سارے عمل میں ایک عامل کے طور پر موجود رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ شدت پسند گروہوں کا نشانہ بھی بنتا رہا ہے۔ نجی میڈیا نے بڑی حد تک انتہا پسندی کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ 1950ء میں حکومت نے شدت پسندانہ خیالات کی اشاعت اور فروغ کے لئے ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا۔

ضیاء الحق کے دور حکومت میں ذرائع ابلاغ پر اثر انداز ہونے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی۔ جماعت اسلامی چونکہ جنرل ضیاء الحق کے بہت قریب تھی اور ضیاء نے جماعت اسلامی کو افغان جنگ میں بھی استعمال کیا تھا۔ چنانچہ اسکے بہت سے لوگ ذرائع ابلاغ میں شامل ہو گئے جنہوں نے پنجاب یونین آف جرنلسٹس کی متبادل یونین کی بنیاد رکھی وہ تمام جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ عسکریت پسند تھے اور اپنے اپنے نظریات کی بنیاد پر لوگوں کی جانیں لے رہے تھے۔ اس گروپ نے اپنے اپنے لوگ ذرائع ابلاغ میں شامل کئے اسکے علاوہ انہوں نے ذرائع ابلاغ کے بہت سے لوگوں کو خریدا اور انہیں اپنے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اس قسم کے لوگ اگرچہ اخبارات کی پالیسی کو براہ راست متاثر نہیں کرتے تاہم اگر ایک شخص نیوز روم میں یا رپورٹنگ میں ایک خاص سوچ لیکر بیٹھا ہوا ہے تو اسکے پاس موقع ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی خبر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے یا کوئی خبر اس طرح دے کہ اسکی اہمیت کم ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اگر کہیں پٹاخہ بھی چلتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ دھماکے کی آواز سنی گئی ہے پولیس جگہ کا تعین کر رہی ہے، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شدت پسندوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ طالبان کے ترجمان کو بہت زیادہ کوریج ملتی ہے۔ ہمارے ہاں ذرائع ابلاغ میں گیٹ کیپنگ کی روایت معدوم ہے جو شخص میڈیا سے منسلک ہے اسے ایک گیٹ کیپر کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ نیوز رپورٹر یا ایڈیٹر کو خبر کی اشاعت کے حوالے سے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اگر کوئی خبر معاشرے کے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ پہنچائے گی تو وہ اسے روک لے۔

ہمارا الیکٹرانک میڈیا حال ہی میں سامنے آیا ہے اور لوگ اس کے لئے مناسب طور پر تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ پرنٹ میڈیا میں جب کوئی چیز تحریر ہوتی ہے تو تحریر کرنے والے کے پاس کچھ وقت ہوتا ہے کہ وہ اسکو دوبارہ دیکھ سکے اور پھر وہ تحریر مدیر کی نظر سے بھی گزرتی ہے۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے ہمارے ٹی وی چینل شدت پسندی سے متعلق واقعات کو اکثر غیر موزوں طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ مزید براں پاکستان میں پرنٹ میڈیا کے پاس کوئی ڈیڑھ سو سال کا تجربہ ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا مقابلتاً نوخیز ہے۔

اگر معاشرہ انتہا پسند نظریات سے لیس ہے، یعنی اگر ریاست کی عمل داری کم ہو چکی ہے اور انتہا پسند حلقوں کا رسوخ معاشرے پر زیادہ ہے تو میڈیا میں بھی وہی چیز آپکو نظر آئے گی۔ میڈیا عدم استحکام میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے تو یہی لگتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ میڈیا اس امر کو مسلسل نظر انداز کر رہا ہے کہ ایسا کرنے سے مستقبل میں اظہار رائے کی آزادی برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

اقلیتیں

5 ہندو خاندان بھارت روانہ

شکارپور 2 اگست کو ضلع جیکب آباد کی تحصیل ٹھل کے ہندو محلّہ میں بدامنی ، بے روزگاری، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ سے تنگ آ کر پانچ ہندو خاندان لاہور سے واہگہ کے راستے بھارت روانہ ہوگئے۔ مہندر کے مطابق کچھ خاندان بدامنی کی وجہ سے جبکہ کچھ خاندان سیر وتفریح کے لئے بھارت جارہے ہیں جو ایک ماہ بعد واپس لوٹ آئیں گے۔

(شاکر جمالی)

احمدی مخالف نفرت انگیز اجتماعات

ربوہ چناب نگر میں احمدی افراد کی آبادی تقریباً 95 فیصد ہے۔ مگر ان کو اپنے تربیتی پروگرامز اور سالانہ اجتماعات کے انعقاد کی اجازت نہیں ہے جبکہ اس کے بالمقابل جماعت احمدیہ مخالف تنظیموں کو بیرون از ربوہ سے مختلف افراد کو قافلوں کی صورت لاکر جلسے کرنے جلوس نکالنے، سرعام لاؤڈ سپیکر پر اکابرین جماعت احمدیہ کو گالیاں دینے، شرانگیزی کے مواقع پیدا کرنے اور امن عامہ کے مسائل پیدا کرنے کی کھلی چھٹی دی جاتی ہے۔ حالیہ سنگین صورتحال کے پس منظر میں موجودہ حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہ دی جائے اور نہ ہی سرکاری سطح پر ان عناصر کی سرپرستی کی جائے تاہم اگر اجازت دینا ناگزیر ہو تو شرکاء کانفرنس کو اس امر کا پابند کیا جائے کہ آنے جانے کے لیے صرف مرکزی راستے ہی اختیار کئے جائیں۔ دیگر متعدد شہروں میں بھی اس نوعیت کی مخالفانہ سرگرمیاں اور کانفرنسز جاری ہیں جن کی بناء پر افراد جماعت احمدیہ کے خلاف ناخوشگوار واقعات رونما ہو رہے ہیں اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ متذکرہ بالا کانفرنس کا انعقاد بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ احمدیوں کے خلاف اس نوعیت کے اقدامات کو جنت کے حصول کا ذریعہ اور جہاد عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں خدانخواستہ اس کانفرنس کی بناء پر کسی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے کی صورت میں حالات واقعات کی تمام تر ذمہ داری یقیناً مذکورہ شرکاء اور انتظامیہ پر ہوگی۔ امید ہے کہ مقامی انتظامیہ اس شہر کے امن کو قائم رکھنے کے لیے پیش بندی کی غرض سے مناسب لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے اقدامات کرے گی۔ (سلیم الدین)

اقلیتی عبادت گاہوں پر غیر قانونی قبضوں کا نوٹس لیا جائے

کرک انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق گذشتہ پچاس سالوں میں پاکستان میں بسنے والے نوے فیصد ہندو ملک چھوڑ چکے ہیں اور اب ان کی عبادت گاہیں اور قدیم مندر، گرجا گھر اور گردوارے، بھی تیزی سے غائب ہو رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک معاملہ خیبر پختونخوا کے ضلع کرک میں گذشتہ بیس سال سے چل رہا ہے اور اب سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود اس پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ بات ہے، پاکستان کے صوبے خیبر پختونخوا کے ضلع کرک کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹیری میں واقع ایک سمادھی کی، جہاں کسی زمانے میں، کرشن دوارا نامی ایک مندر بھی موجود تھا۔ مگر اب اس کے آثار کہیں نہیں ہیں۔ سمادھی موجود ہے، مگر اس کے اردگرد ایک مکان کی تعمیر ہو چکی ہے اور اس تک رسائی کے تمام راستے بند ہیں۔ مکان میں بسنے والے مفتی افتخار الدین کا دعویٰ ہے کہ انیس سو اکسٹھ میں حکومت پاکستان نے، سکیم سات کا اجراء کیا تھا جس کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان میں مقامی قابضین کو ایسی دیہی املاک مفت میں دی گئیں جن کی قیمت دس ہزار روپے سے کم تھی۔ اسی سکیم کے تحت انھیں بھی اس جگہ کے مالکانہ حقوق مل گئے اور انیس سو اٹھانوے میں انھوں نے اس مکان کو تعمیر کیا۔ ہندوؤں کے رہنما شری پرم ہنس جی مہاراج 1919ء میں انتقال کر گئے۔ ان کو شردھانجلی دینے دنیا بھر سے کئی ہندو پاکستان کے علاقے ٹیری میں واقع ان کی اس سمادھی پر حاضری دیا کرتے تھے۔ انیس سو اٹھانوے میں یہ معاملہ اس وقت منظر عام پر آیا جب کچھ ہندو یہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ سمادھی کو توڑنے کی کوشش کی گئی جس پر بات پاکستان ہندو کونسل تک پہنچی اور کونسل نے اس معاملے کا بیڑا اٹھایا۔ کونسل کے چیئرمین اور ممبر قومی اسمبلی ڈاکٹر رمیش وانکوانی نے بتایا کہ گذشتہ بیس سال کے دوران وہ تمام سیاسی عناصر سے صوبائی اور وفاقی سطح پر بات کر چکے ہیں مگر کسی نے نہیں سنا، بالآخر انھوں نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سپریم کورٹ نے اپریل 2015ئ میں تمام حالات کو دیکھتے ہوئے، خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومت کو حکم دیا کہ وہ اس سمادھی میں ہونے والی توڑ پھوڑ کو روک کے ہندوؤں کو ان کی جگہ واپس کروائے۔ مگر آج تک اس پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر رمیش کہتے ہیں 'مزار تو تاریخی ہوتے ہیں، یہ کوئی مندر تو ہے نہیں کہ مجھے کہیں کہ لا اینڈ آرڈر کی صورتحال خراب ہے تو میں اسے کہیں اور منتقل کر دوں، یہ تو سمادھی ہے۔ مزار ہے! ایک ایسی ہستی کا مزار جس کے کروڑوں پیروکار ہیں۔' مگر ٹیری میں واقع واحد یہ ایک سمادھی یا مندر ہی نہیں جو بند ہے۔ پاکستان ہندو کونسل کے مطابق اس وقت ملک بھر میں تمام مذہبی اقلیتوں کی ایسی ایک ہزار چار سو سے زیادہ مقدس جگہیں ہیں جن تک انھیں رسائی حاصل نہیں۔ یا پھر انھیں ختم کر کے وہاں دکانیں، خوراک کے گودام، جانوروں کے باڑوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک مندر، راولپنڈی کے ایک مصروف بازار میں موجود ہے جسے جمنا دیوی مندر کہا جاتا ہے اور یہ 1929ء میں بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف سے چھوٹی دکانوں میں دھنسا یہ مندر محض اپنے ایک بچے کھچے مینار کے باعث اب بھی سانسیں لے رہا ہے مگر اس کے اندر داخل ہوں تو یہاں فرش پر پڑی اور چھتوں سے باتیں کرتی اونچی اونچی قطاروں میں چاول، دال اور چینی کی بھری بوریاں نظر آتی ہیں۔ محکمہ اوقاف کے چیئرمین صدیق الفاروق کا کہنا ہے کہ 'جو سکیم 1975ء فائیو ہے، میں اس کو جانتا ہوں اور اس سے پہلے کیا تھا یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ پارلیمنٹ کی بنائی گئی اس سکیم کے تحت، عبادت گاہ کوئی بھی ہو، وہ کرائے پر نہیں دی جا سکتی، البتہ اس سے ملحقہ اراضی کو کرائے پر دیا جاتا ہے۔' راولپنڈی میں جمنا دیوی مندر چاروں طرف سے چھوٹی دکانوں میں دھنسا ہے اور یہ مندر محض اپنے ایک بچے کھچے مینار کے باعث اب بھی سانسیں لے رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق حکومت کی عدم توجہ اور غلط پالیسیز کے باعث ملک میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی مذہبی اقلیت ہندو برادری ہے جسے پسماندہ ہونے کے باعث ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ برصغیر کے بٹوارے کے وقت، مغربی پاکستان یا موجودہ پاکستان میں، پندرہ فیصد ہندو رہتے تھے۔ 1998ئ میں ملک میں کی گئی آخری مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد محض ایک اعشاریہ چھ فیصد رہ گئی اور ملک چھوڑنے کی ایک بڑی وجہ عدم تحفظ تھی۔ تحقیق کار ریما عباسی کے نزدیک محض 'گذشتہ چند سالوں میں لاہور جیسی جگہ پر ایک ہزار سے زیادہ مندر ختم کر دیے گئے ہیں۔ پنجاب میں ایسے لوگ بھی دیکھ چکی ہوں جو نام بدل کر رہنے پر مجبور ہیں۔ ان تمام باتوں کی بڑی وجہ، قبضہ مافیا تو ہے مگر ساتھ ہی ان بے گھر افراد کے لیے تحفظ کی کمی بھی ہے، جو شدت پسندی کے باعث اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان کے دیگر ایسے علاقوں میں منتقل ہوتے ہیں جہاں ان کی عبادت گاہیں قریب ہیں۔ مگر انھیں وہاں سے ڈرا دھمکا کر نکال دیا جاتا ہے تاکہ وہاں پہلے سے رہائش پذیر افراد کو کوئی مشکل نہ ہو۔ پاکستان کے محکمہ اوقاف میں پجاری کی ملازمت کرنے والے جے رام کے مطابق 1971ء کے بعد ملک میں ہندو کلچر ہی ختم ہو گیا۔ کہیں بھی اب شاستروں کو نہیں پڑھایا جاتا، سنسکرت نہیں پڑھائی جاتی، یہاں تک کے سندھ حکومت ایک بل پاس کروانے کی کوشش تھی کہ سندھ میں نصاب میں سنسکرت کو شامل کیا جائے، ہندو بچوں کے لیے ہمیں ایک ہندی استاد مہیا کیا جائے، مگر وہ بل پاس نہیں ہوا۔ تو اگر اس قسم کا قانون نہیں بن سکتا تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان میں ایک بھی ہندو نہیں رہے گا۔

(نامہ نگار)

ہندو خاتون کا ریپ: پولیس کا ایف آئی آر درج کرنے سے انکار

کراچی ملک کی پسماندہ کمیونٹیز کی خواتین کی بااثر افراد کے ہاتھوں استحصال اور ریاست کی جانب سے اس طرف سے آنکھیں بند کرنے کا معاملے پس پردہ ہی رہتا اگر اس حوالے سے ایک پریس کانفرنس نہ کی جاتی۔ ٹھٹھہ کی رہائشی 30 سالہ ایمی خواتین اور بچوں پر تشدد اور بدسلوکی کے حوالے سے کام کرنے والی ایک این جی او "مددگار" کی مدد سے انصاف کی تلاش میں ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پولیس نے نہ صرف ایمی کی شکایت پر ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کیا بلکہ انھیں جنسی طور پر ہراساں بھی کیا۔ ایمی کے مطابق اس معاملے سے حکومت کو تحریری طور پر آگاہ کیا گیا لیکن کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ مددگار ہیلپ لائن کے تعاون سے ان کے دفتر میں منعقد کی گئی ایک پریس کانفرنس کے دوران ایمی نے بتایا: "جب میں اپنی شکایت لے کر ٹھٹھہ پولیس کے پاس گئی تو کسی نے میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور وہاں موجود اسٹاف نے مجھ پر ہنسنا شروع کر دیا، مجھے کہا گیا کہ میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ڈی ایس پی) مکلی کے گھر جا کر ایف آئی آر درج کراؤں۔" ایمی نے بہتے آنسوؤں کے دوران پولیس افسران پر ان کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ "میرا 8 سال تک استحصال کیا گیا اور میں نے انصاف کا مطالبہ کیا۔ ایمی کی مشکلات کا آغاز اس وقت ہوا جب 2008 میں ان کی ایک شخص سے فون پر دوستی ہوئی۔ میر پور ساکرو کے رہائشی شہباز نامی شخص نے ایمی کو اپنے گھر کے باہر ملنے کا کہا اور پھر رمضان نامی ایک اور شخص کی مدد سے انھیں اغواء کر لیا۔ وہ ایمی کو ایک نامعلوم مقام پر لے گئے جہاں 20 دن تک انھیں ایک اندھیرے کمرے میں رکھا گیا، تشدد کیا گیا اور انھیں ریپ کا نشانہ بنایا گیا۔ ایمی نے بتایا کہ بعدازاں انھیں فروخت کر کے نوابشاہ لے جایا گیا۔ نوابشاہ میں ایمی پر دباؤ ڈال کر ہندو مت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کے لیے کچھ کاغذات پر دستخط کروائے گئے اور پھر جاوید خاصخیلی نامی ایک شخص سے جعلی شادی کروا دی گئی، جس نے ایمی کو جسم فروشی پر مجبور کیا۔ انھوں نے 2 مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی جس کی انھیں سزا دی گئی۔ ایمی نے بتایا کہ انھیں جلایا گیا، پہلے وہ نوابشاہ کے ایک ہسپتال میں اور پھر حیدرآباد میں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں زیرِ علاج رہیں۔ پریس کانفرنس کے دوران ایمی نے بتایا کہ انھیں جاوید کی اہلیہ کی حیثیت سے اپنی شناخت کروانے کا کہا گیا جبکہ انھیں زہر بھی دیا گیا۔ ایمی کے مطابق انھوں نے حیدرآباد میں 6 سال قید میں گزارے جس کے دوران وہاں ان کی 3 لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جنھیں جسم فروشی کے لیے خریدا گیا تھا۔ آخر کار رعید کے دوسرے دن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں اور ٹھٹھہ میں اپنے گھر پہنچیں، لیکن یہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ ان کے واحد قریبی رشتے دار، والد کا ان کے اغواء کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ایک دوست کی مدد سے میں کراچی کی عدالت آئی جہاں مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ مجھے مددگار سے مدد لینی چاہیے۔ ایمی نے ان کو قید میں رکھنے والوں میں سے ایک کی تصویر اور شناختی کارڈ بھی میڈیا بریفنگ کے دوران دکھایا۔ اس حوالے سے مددگار کے ایڈووکیٹ ضیاء اعوان نے بتایا کہ ان کی تنظیم نے متاثرہ خاتون کا کیس تیار کر لیا ہے اور متعلقہ پولیس افسران سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن پولیس یہ کیس درج کرنا ہی نہیں چاہتی۔ انھوں نے بتایا کہ ٹھٹھہ پولیس کا اصرار ہے کہ یہ کیس ان کی حدود میں نہیں آتا اور اس حوالے سے میر پور ساکرو پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ ہم نے مذکورہ خاتون کو وہاں جانے کا کہا لیکن انھوں نے بھی یہ کیس رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا تاہم دونوں پولیس اسٹیشنز نے درخواست قبول کر لی ہے۔ ضیاء اعوان کے مطابق جب ان کی این جی او کو وزیر برائے کلچر شرمیلا فاروقی سمیت حکومت کی جانب سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا تب ہی ہم نے یہ کیس میڈیا کے سامنے لانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کی جانب سے ایکشن نہ لیا جانا اور انصاف کی عدم فراہمی بھی ایک طرح کی دہشتگردی ہے، "ہم چاہتے ہیں کہ اس کیس کی سنجیدگی سے تفتیش کی جائے اور مجرمان کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ ضیاء اعوان کا مزید کہنا تھا کہ یہ معاملہ تو پہاڑ کی ایک چوٹی جیسا ہے، زیادہ تر کیسز تو رپورٹ ہی نہیں ہوتے اور بہت سے کیسز جو ہم تک پہنچتے ہیں، ان میں ظلم کا شکار افراد میڈیا کے سامنے آ کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ انھوں نے پولیس اور انصاف کے نظام کو فعال بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

ہندو شادی کے قانون میں صوبائی حکومتوں کی عدم دلچسپی

اسلام آباد ڈیڑھ برس قبل قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے ہندو میرج بل کو صوبائی حکومتوں کی عدم دلچسپی کے باعث ابھی تک منظور نہیں کیا جا سکا۔ ہندو برادری کا کئی دہائیوں سے مطالبہ ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں کی شادیوں اور طلاق کے اندراج کا نظام قائم کیا جائے۔ پاکستان میں ہندوؤں کی شادیوں کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے ہندو برادری کو نہ صرف جبری شادیوں اور مذہب تبدیل کرنے کے مسائل کا سامنا ہے بلکہ طلاق اور قومی شناختی کارڈ کے حصول میں بھی مشکلات درپیش ہیں۔ اسی وجہ سے گذشتہ برس قومی اسمبلی میں اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے دو رکنِ پارلیمان نے نجی طور پر پارلیمان میں ہندو میرج بل کے نام سے ایک مسودہ قانون متعارف کرایا تھا۔ اس بل کے بعد، حکومت کی جانب سے بھی اس سال مارچ میں ہندوؤں کی شادیوں کے لیے ایک اور بل پیش کیا گیا۔ بہت سے ہندو سماجی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے بھارت ہجرت کر گئے ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ ن کے رکنِ پارلیمان ڈاکٹر رمیش وانکوانی ان رکنِ پارلیمان میں سے ایک ہیں جنھوں نے ہندو میرج بل کو گذشتہ برس قومی اسمبلی میں پیش کیا تھا اور وہ قائمہ کمٹی کے اجلاس میں آج موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اجلاس میں پیش رفت نہیں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ مولانا شیرانی بھی قائمہ کمیٹی کے رکن ہیں اور انھوں نے آج کے اجلاس میں ایسی بات کی جس سے رویوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں کی اکثریت سندھ میں آباد ہے۔ بہت سے ہندوؤں سماجی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے بھارت ہجرت کر گئے ہیں۔ 'مولانا شیرانی صاحب نے کہا کہ اگر ہندو میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور ان کا ایک بچہ یا بچی مسلمان ہو جائے تو وہاں پر شادی ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ جب ایک بچی کی شادی ہو جائے تو اس کی دوبارہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟' اس سال اپریل میں سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 144 کے تحت ہندوؤں کی شادی کے لیے ایک قومی قانون کے لیے ضروری ہے کہ چاروں صوبوں کی اسمبلیوں میں اس سلسلے میں قراردادیں منظور ہوں۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد ہندوؤں کی شادی کے معاملے کا اختیار صوبوں کے پاس ہے، اور ہندوؤں کے شادیوں کے اندراج کے لیے ایک قومی ادارہ قائم کرنے لیے صوبائی اسمبلیوں کو عمل میں شامل کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر رمیش نے مزید کہا کہ 'صرف بلوچستان اور خیبر پختونخوا نے مہینے کے آخر تک قانون منظور کرنے کا وعدہ کیا۔ پاکستان کے قائم ہونے کے اڑسٹھ برسوں میں ہندوؤں کی شادی اور طلاق کا طریقہ کار وضع نہیں ہے، جس کی وجہ سے ہندو برادری کو کئی مسائل کا سامنا ہے، جیسے کہ جبری شادیاں، مذہب کی تبدیلی، شوہر کے نام کا قومی شناختی کارڈ، طلاق، اور وراثت کے مسائل۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

قصور میں بچوں سے جنسی زیادتی کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ

(پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اور اے۔جی۔ایچ۔ایس کی تحقیقاتی رپورٹ)

پس منظر

بچوں سے جنسی زیادتی/استحصال کا ایک سکینڈل اس وقت منظر عام پر آیا جب قصور میں مظاہرین اور پولیس کے درمیان جھڑپوں (اگست کے پہلے ہفتے کے دوران) کی خبریں موصول ہوئیں۔ان جھڑپوں میں دو درجن سے زائد مظاہرین اور پولیس کے دعوے کے مطابق 28 پولیس اہلکار زخمی ہوئے۔اس احتجاج کی وجہ یہ تھی کہ پولیس اس سال مئی اور اگست کے مہینوں کے دوران بچوں سے جنسی زیادتی سے متعلق درج کرائی جانے والی ایف آئی آر میں نامزد ملزمان کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تھی۔

پریس اور الیکٹرانک میڈیا نے ایسی سینکڑوں ویڈیوز کی موجودگی کا انکشاف کیا ہے جن میں تقریباً تین سو بچوں سے جنسی زیادتی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ متاثرین کے خاندانوں اور مقامی سماجی کارکنوں نے پولیس پر حقائق اور شواہد پر پردہ ڈالنے، ملزمان کے تحفظ کے لئے مقامی سیاستدانوں کے اثر و رسوخ اور ملزمان اور پولیس کی جانب سے مدعین اور گواہوں کو دھمکانے کا الزام عائد کیا ہے۔

11 اگست کو جب ٹیم نے قصور کا دورہ کیا تو اسی دن وزیراعلیٰ پنجاب کے حکم پر ایک مشترکہ تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی جا چکی تھی۔

میڈیا کی رپورٹس کے بعد ایچ آر سی پی اور اے جی ایچ ایس کے چائلڈ رائٹس یونٹ نے ایک نورکنی مشترکہ ٹیم تشکیل دی جس نے 11 اگست 2015ء کو قصور کے گاؤں حسین خان والا کا دورہ کیا۔ٹیم نے متعلقہ تھانے اور گاؤں کا دورہ کیا اور مقامی پولیس، کچھ متاثرین کے خاندانوں اور چند دیگر افراد کے انٹرویو کیے جن کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ مقامی سماجی کارکن ہیں اور وہ مدعین کی مدد کر رہے ہیں۔

حقائق کی چھان بین

ٹیم نے اپنی فیکٹ فائنڈنگ کا آغاز متعلقہ پولیس اسٹیشن تھانہ گنڈا سنگھ والا سے کیا۔اس تھانے کے ایس ایچ او کو حال ہی میں اس وقت معطل کر دیا گیا تھا جب متاثرہ خاندانوں نے شکایت کی کہ اس نے ملزمان کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی اور ان تمام افراد کی ویڈیو بناتا جو جرم سے متعلق معلومات فراہم کرنے یا اپنے بچے یا رشتے دار کے ساتھ جنسی زیادتی کی شکایت درج کرانے کے لئے تھانے سے رابطہ کرتے۔ نئے ایس ایچ او کی تقرری پہلے ہی کی جا چکی تھی لیکن اس نے ٹیم سے ملنے سے انکار کر دیا۔اگرچہ تھانے میں موجود میڈیا کے چند افراد نے ایس ایچ او کو تھانے میں دیکھا تھا تاہم تھانے کے عملے نے ٹیم کو بتایا کہ ایس ایچ او فیلڈ ڈیوٹی پر تھا۔ڈی پی او قصور کے دفتر کا دو مرتبہ دورہ کرنے اور ان سے فون پر رابطہ کرنے کی متعدد کوششوں کے باوجود ٹیم کا ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔بعد ازاں جب ٹیم قصور سے واپس آ گئی تو یہ معلوم ہوا کہ وزیراعلیٰ کے حکم پر ڈی پی او کو معطل کر دیا گیا تھا۔

> مبین احمد نے دعویٰ کیا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس زمین پر ایک ہسپتال اور بچوں کے لئے ایک کرکٹ گراؤنڈ تعمیر کیا جائے۔ یہ رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ ویڈیو کلپ کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے اور جنسی زیادتی سے متعلق گروہی سرگرمیوں کے الزامات محض افواہوں پر مبنی تھے۔اگر مستقبل میں ایسی سرگرمی کی کوئی بلاواسطہ شکایت موصول ہوئی تو اس پر مناسب کاروائی کی جائے گی۔

تاہم تھانے کے محرر اور نائب محرر ٹیم کو متعلقہ معلومات فراہم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ایچ آر سی پی ان کے تعاون کی قدر کرتا ہے۔ٹیم کو بتایا گیا کہ ٹیم کے فیکٹ فائنڈنگ دورے کے دن (11 اگست) تک مختلف متاثرین کے اہل خانہ کی جانب سے 15 ملزمان کے خلاف 8 ایف آئی آر درج کی گئیں۔ان میں وہ ایف آئی آر بھی شامل تھی جو اس سے پہلے درج ہونے والی ایف آئی آروں میں سے ایک کے مدعی نے مجرمانہ دھمکی کی بنا پر ملزمان کے خلاف درج کرائی تھی۔ پولیس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق 12 ملزمان کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا، ایک ملزم تنزیل الرحمان کی قبل از گرفتاری عبوری ضمانت 11 اگست 2015ء کو منسوخ ہو چکی تھی اور اسے بھی گرفتار کیا جا چکا تھا، اور دو ملزمان عرفان احمد اور وسیم سندھی تا حال مفرور تھے۔تمام ملزمان کا تعلق ایک ہی گاؤں سے تھا اور متاثرہ خاندانوں کے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔ بہت سے ملزمان ایک دوسرے کے رشتے دار تھے۔گرفتار ملزمان میں مرکزی ملزم حسیم عامر اس کا باپ اور دو بھائی شامل تھے۔وہ گرفتار ملزمان جو اب بھی ریمانڈ پر تھے انہیں سکیورٹی وجوہات کی بنا پر شہر کے کسی اور تھانے میں رکھا گیا تھا کیونکہ عوام اب بھی مشتعل تھے۔سب سے پہلی ایف آئی آر ایک متاثرہ بچے کے بھائی ملک عثمان نے یکم جولائی 2015ء کو درج کرائی تھی۔اسی روز دیگر مدعین کی جانب سے دو مزید ایف آئی آر درج کرائی گئیں۔اس کے بعد کی ایف آئی آر 4، 9، اور 13 جولائی 2015ء کو درج کرائی گئیں۔

پولیس کے مطابق گاؤں حسین خان والا میں ایک مجرمانہ گروہ کے بارے میں ''خفیہ معلومات'' مئی 2015ء کے آخر میں موصول ہوئیں۔ یہ گروہ بچوں سے جنسی زیادتی کے بعد ان کی ویڈیو بنا لیتا اور انہیں متاثرین کے خاندانوں کو بلیک میل کرنے اور ان سے رقم بٹورنے کے لئے استعمال کرتا۔ پولیس کو یہ اطلاع بھی ملی کہ گاؤں کے لوگ اس حوالے سے ایک احتجاجی مظاہرہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ پولیس کی ایک پارٹی نے ''خفیہ'' رپورٹ کی تحقیقات کے لئے 26 مئی 2015ء کو گاؤں کا دورہ کیا۔ پولیس کے اس دورے کے بعد محرر محمد امین کی جانب سے لکھی گئی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گاؤں کے جن ''معززین'' سے پوچھ گچھ کی گئی انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ چند خاندانوں نے شکایت کی تھی کہ گاؤں میں ایک نامعلوم گروہ بچوں سے جنسی زیادتی کے بعد ان کی ویڈیو کو بلیک میل کرنے اور رقم اینٹھنے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان ''معززین'' میں سے ایک مبین احمد ولد معیز الدین نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ یہ الزامات محکمہ انہار کی زیر ملکیت اس سرکاری زمین کے مسئلے پر لوگوں کے ایک اجتماع کے دوران سامنے آئے تھے جسے گاؤں کے چند افراد سیاسی اثر و رسوخ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مبین احمد نے دعویٰ کیا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس زمین پر ایک ہسپتال اور بچوں کے لئے ایک کرکٹ گراؤنڈ تعمیر کیا جائے۔ یہ رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ ویڈیو کلپ کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے اور جنسی زیادتی سے متعلق گروہی سرگرمیوں کے الزامات محض افواہوں پر مبنی تھے۔اگر مستقبل میں ایسی سرگرمی کی کوئی بلاواسطہ شکایت موصول ہوئی تو اس پر مناسب کاروائی کی جائے گی۔

اس رپورٹ کے خالق محرر محمد امین نے ٹیم کو میڈیا سے ملنے والی ان رپورٹس کی صاف تردید کی کہ پولیس کو اسی ملزم کے خلاف جنسی زیادتی کے ایک واقعے کی شکایت بشیراں نامی خاتون کی جانب سے 2013ء میں موصول ہوئی تھی جس کا بیٹا جنسی زیادتی کا نشانہ بنا تھا۔ پولیس افسر نے اس بات کی

بھی تردید کی کہ ملزم نے پولیس کے ساتھ مل کر بشیراں کو تھانے میں تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

محرر کو اس بات کا علم تھا کہ ایک مشترکہ تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی جا چکی تھی لیکن وہ تفتیشی افسر، جسے یہ کیس سونپا گیا تھا، کی جانب سے ہونے والی تحقیقات کی پیش رفت کے بارے میں کسی قسم کی معلومات فراہم نہ کر سکا۔ تفتیشی افسر، سب انسپکٹر تھانہ گنڈا سنگھ والا ٹیم سے ملاقات کے لئے موجود نہیں تھا۔ اگرچہ محرر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ قابل اعتراض ویڈیوز کی تعداد سینکڑوں میں تھی تاہم اس نے اس بات کی تردید کی کہ متاثرین کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ عین اسی وقت اس نے پولیس کو درج کرائی گئیں ایف آئی آر کے علاوہ تمام متاثرین کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ ٹیم کی جانب سے قابل اعتراض ویڈیوز کی برآمدگی اور ان کے مزید پھیلاؤ کو روکنے کے حوالے سے پولیس کے اقدامات سے متعلق ایک سوال پر پولیس افسر نے کہا کہ ان ویڈیوز کے پھیلاؤ اور دیگر استعمال کو روکنے کے لئے گاؤں میں سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار تعینات کئے گئے تھے، لیکن اب تک ایسا کوئی مواد برآمد نہیں ہوا۔

گاؤں کے دورے کے دوران ٹیم نے چند متاثرین، ان کے اہل خانہ، میڈیا کے افراد اور گاؤں کے ایک رہائشی مبین غزنوی سے ملاقات کی جو ایک مقامی سماجی کارکن اور متاثرہ خاندانوں کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ گاؤں کے مکین ایچ آر سی پی کو مبین کے رشتے داروں کی زیر ملکیت ایک گھر میں لے گئے جہاں صحافیوں، الیکٹرانک میڈیا، گاؤں کے رہائشیوں اور متاثرین اور ان کے خاندانوں سمیت بہت سے لوگ جمع تھے۔ ٹیم نے متعدد متعلقہ افراد سے بات کی۔ تاہم مدعی خاندانوں کی طرف سے مبین احمد نے گفتگو کی۔

مبین غزنوی کے مطابق ویڈیوز کی موجودگی کا انکشاف تقریباً سات سے آٹھ ماہ پہلے ہوا جب متاثرہ بچوں میں سے ایک اپنے موبائل فون میں انڈین فلم ڈاؤن لوڈ کرانے کے لئے موبائل کی ایک دکان پر گیا اور دکاندار نے اس موبائل کا میموری کارڈ اپنے پاس رکھ لیا۔ گاؤں میں ان ویڈیوز کا پھیلاؤ اس وقت شروع ہوا اور لوگوں کو اس سرگرمی کا پتا چلا۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب بشیراں بی بی اس ملزم کے بارے میں شکایت درج کرانے کے تھانے گئی جس نے اس کے بیٹے کو زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ مبین نے اس الزام کی تائید کی کہ تھانہ گنڈا سنگھ والا میں پولیس نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا اور اس کی شکایت درج نہ کی۔

ان ویڈیوز کی اہانت آمیز نوعیت اور دونوں اطراف کے کئی افراد کے ساتھ قریبی تعلقات کی وجہ سے گاؤں کے لوگ کئی ماہ تک اس معاملے پر خاموش رہے۔

بہت سے والدین/ خاندان یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ بہت سے متاثرہ بچے اپنے خاندانوں کے پیسے اور زیورات چرا رہے تھے تاکہ وہ ان ملزمان کو بھتے کی رقم ادا کر سکیں جو انہیں بلیک میل کر رہے تھے اور ویڈیوز کو منظر عام پر لانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ والدین اس چوری کا علم ہونے پر اپنے بچوں کی سرزنش کرتے لیکن چوری کے مقدمات درج نہ کراتے۔ تاہم چند ایسے خاندان بھی تھے جنہوں نے اس سکینڈل کو منظر عام پر آنے سے روکنے کے لئے ملزمان کو رقم کی ادائیگی کی۔

محرر کو اس بات کا علم تھا کہ ایک مشترکہ تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی جا چکی تھی لیکن وہ تفتیشی افسر، جسے یہ کیس سونپا گیا تھا، کی جانب سے ہونے والی تحقیقات کی پیش رفت کے بارے میں کسی قسم کی معلومات فراہم نہ کر سکا۔ تفتیشی افسر، سب انسپکٹر تھانہ گنڈا سنگھ والا ٹیم سے ملاقات کے لئے موجود نہیں تھا۔ اگرچہ محرر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ قابل اعتراض ویڈیوز کی تعداد سینکڑوں میں تھی تاہم اس نے اس بات کی تردید کی کہ متاثرین کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔

کچھ عرصے کے بعد بشیراں بی بی سمیت چند والدین کو گاؤں کے ذرائع سے ان ویڈیوز کا علم ہوا، اور لوگوں کے ایک گروہ نے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم زیادہ تر متاثرین کے خاندان رسوائی کے ڈر سے قانونی کارروائی کرنے یا اپنے بچوں سے جنسی زیادتی کے واقعے کو افشا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ابتدا میں گاؤں کے عمائدین کے درمیان مشاورت ہوئی اور اس بات پر اتفاق ہوا کہ قانون کا سہارا لئے بغیر کسی مصالحت پر پہنچا جائے۔ مبین کے مطابق پنچائیت نے اس معاملے پر بحث کی اور، اگر تمام لوگ تعاون کرتے تو ملزمان اور مدعی خاندانوں کے درمیان تصفیے کے ذریعے یہ مسئلہ گاؤں کی سطح پر حل کر لیا جاتا۔ تاہم کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا۔ آخر کار بشیراں اس معاملے کو پولیس کے پاس لے گئی۔ اس سے دوسرے لوگوں کے لئے بھی رسمی شکایات درج کرانے کا راستہ کھل گیا۔

باوجود اس کے کہ جولائی 2015ء کے اوائل سے ایف آر درج کرائی جا رہی تھیں، پولیس نے زیادہ تر ملزمان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ پولیس نے تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہ کی بلکہ انہوں نے نہ صرف کھلے عام ملزموں کے ساتھ ساز باز کر لی بلکہ متاثرہ خاندانوں اور ان کے طرفداروں کو دھمکانے اور انہیں ہراساں کرنے میں بھی ان کی مدد کی۔ اس کے نتیجے میں مدعی خاندانوں اور گاؤں کے دیگر افراد نے اگست میں احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرہ اس وقت تشدد کی شکل اختیار کر گیا جب پولیس نے مظاہرین کے خلاف طاقت کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں متعدد لوگ زخمی ہو گئے۔ مظاہرے کے بعد میڈیا کو اس پورے سکینڈل کا علم ہو گیا۔

پولیس نے ہمیشہ ایک جانبدارانہ کردار ادا کیا ہے اور یہ اب بھی شواہد کو چھپا رہی ہے اور ان کی غفلت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اس نے ایک ٹیلی ویژن چینل کا حوالہ دیا جس نے اس ''حویلی'' کے اندر فلم بندی کی تھی جہاں بچوں سے جنسی زیادتی کے چند واقعات پیش آئے تھے۔ اس ویڈیو میں وہ ''ٹیکے اور نشہ آور ادویات'' دکھائی گئی تھیں جنہیں بظاہر ان جرائم کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے اس ثبوت کی حفاظت کرنے کی زحمت نہ کی اور اس جگہ کو ہر ایک کے لئے رسائی کے قابل چھوڑ دیا۔ اس سے پولیس کی غفلت اور ملی بھگت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ پولیس نے ان 72 ویڈیوز سے زیادہ ویڈیوز برآمد کیں جن کا انہوں نے میڈیا سے ذکر کیا۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے ایک متاثرہ بچے کو پولیس کے سامنے یہ گواہی دیتے سنا تھا کہ مختلف بچوں سے جنسی زیادتی کی تقریباً 400 ویڈیوز موجود ہیں۔

اس نے خود بھی چند ویڈیوز دیکھی ہیں اور ملزمان کی نشاندہی کی ہے۔ اس نے تمام ویڈیو نہیں دیکھیں، اس لئے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ متاثرہ بچوں کی تعداد کتنی ہے۔ اس نے جن بچوں سے بات کی وہ سب انہی افراد کا نام لیتے ہیں جنہیں درج کرائی گئیں مختلف ایف آئی آر میں نامزد کیا گیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ ڈی پی او اور آر پی او سیاسی اثر و رسوخ کے زیر اثر ہیں اور وہ اسے زمین کا تنازعہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک سرکاری زمین کے استعمال کے حوالے سے اختلافات تو موجود ہیں لیکن اُس کا اس سکینڈل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس جرم کا خاطر خواہ ثبوت موجود ہے۔ اب یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ دیانتداری سے تحقیقات کرے اور ان افراد کی نشاندہی کرے جو مجرم ہیں اور وہ جو متاثرین ہیں۔

ٹیم نے ایک متاثرہ بچے کی ماں اور آٹھ ایف آئی آر میں سے ایک کی مدعی ثریا بی بی سے بھی بات کی۔ انٹرویو کے شروع کے حصے میں اس کا سولہ سالہ بیٹا بھی وہاں موجود رہا۔ تاہم وہاں بہت سے لوگ موجود تھے جس کی وجہ سے وہ متاثرہ بچوں کی خلوت کی ضمانت نہ دے سکی اور اس نے بچوں سے

درخواست کی کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔ٹیم اس بات سے آگاہ تھی کہ وہ اس اذیت ناک تجربے کے بارے میں واقعے کے چشم دید گواہ بچوں کا انٹرویو کرنے کے لئے تیار نہیں تھی لہٰذا اس نے فیکٹ فائنڈنگ کے دوران ان سے سوالات پوچھنے سے اجتناب کیا۔

محترمہ ثریا نے ٹیم کو بتایا کہ حسیم عامر ولد یحییٰ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر 2011ء سے اس کے بیٹے کو جنسی درندگی کا شکار بناتا رہا اس کے علاوہ وہ اس بہیمانہ جرم کی فلم بھی بناتا رہا ہے۔ میرے بیٹے کو جب پہلی بار جنسی درندگی کا نشانہ بنایا گیا تو اس وقت اس کی عمر بارہ برس تھی۔ ملزم اور اس کا خاندان اس کے ساتھ والے گھر میں رہتے ہیں، اس کے ہمسائے ہیں۔گاؤں میں ان کی شہرت ہمیشہ سے بُری تھی اور حسیم عامر کے والد نے ماضی میں اس کو جنسی طور پر ہراساں کیا تھا اور اس کے ساتھ ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے کے لئے اسے اغواء بھی کیا تھا۔

اس کے بیٹے کے ساتھ ہونے والے جرم کے بارے میں اس کو چند ماہ قبل اس وقت پتہ چلا تھا جب اس درندگی کا شکار بننے والے ایک دوسرے بچے کی ماں نے اس کو بتایا کہ گاؤں میں اس حوالے سے جو فلمیں چلائی جارہی تھیں اس میں اس کا بیٹا بھی نظر آتا تھا جس کے ساتھ یہ بہیمانہ فعل دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک شخص یاسین صوفی کے گھر گئی جس کے پاس یہ فلمیں تھیں اور ان میں سے کچھ اس نے دیکھیں اور ان میں اپنے بیٹے کو پہچانا۔ ثریا نے بتایا کہ گاؤں کے مرد یہ فلمیں دیکھتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ گاؤں میں کیا ہورہا تھا یہ سب کچھ اس سے پہلے کا معاملہ ہے جب ابھی عورتوں کے علم میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

وہ ان فلموں کی تاریخ کے حوالے سے ٹیم کو کچھ بھی بتانے سے قاصر تھی۔ اس نے بتایا کہ پنچائیت کی مشاورت میں وہ شریک ہوتی رہی تھی۔ لیکن چونکہ معاملہ وہاں پر طے نہ ہو پایا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ملزم کے خلاف باقاعدہ رپورٹ درج کرائے گی۔ اس نے بشیراں پر پولیس تشدد کے الزامات کی تصدیق کی اور کہا کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اس کے بعد دوسرے خاندانوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور اپنی ایف آئی آر درج کرانے کے لیے دباؤ بڑھایا۔

اس نے مبین غزنوی کے بیان کی عمومی طور پر تصدیق کی اور اس کو شکایت کنندگان کا ترجمان قرار دیا۔ ٹیم کے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ جن دنوں اس کے بیٹے کو جنسی درندگی کا نشانہ بنایا جاتا رہا، ان دنوں کے دوران اس نے اپنے بیٹے میں کوئی مشکوک قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔

تاہم اس نے شکایت کی کہ اس عرصے کے دوران اس کی پڑھائی بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اور مجرموں کے گروہ کی سرگرمیوں نے گاؤں کے بچوں اور نوجوانوں کے رویوں میں کافی بگاڑ پیدا کردیا تھا۔ اس نے یہ الزام نہیں لگایا کہ اس نے مجرم کو بھتہ دیا یا اس کو رقم ادا کی تاہم اس نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا کہ مجرم اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتا تھا۔ خاص طور پر جب اس نے ایف آئی آر درج کرائی تو یحییٰ کا خاندان اس کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آیا تھا۔ اس خاندان کے اکثر مردوں کی گرفتاری کے بعد حسیم عامر کی ماں ہماری بے عزتی کرتی رہی، وہ ہمیں گالیاں دیتی اور دھمکیاں دیتی اس کی گالیاں اور دھمکیاں دیوار کے دوسری طرف سے صاف اور

> اس کے بیٹے کے ساتھ ہونے والے جرم کے بارے میں اس کو چند ماہ قبل اس وقت پتہ چلا تھا جب اس درندگی کا شکار بننے والے ایک دوسرے بچے کی ماں نے اس کو بتایا کہ گاؤں میں اس حوالے سے جو فلمیں چلائی جارہی تھیں اس میں اس کا بیٹا بھی نظر آتا تھا جس کے ساتھ یہ بہیمانہ فعل دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک شخص یاسین صوفی کے گھر گئی جس کے پاس یہ فلمیں تھیں اور ان میں سے کچھ اس نے دیکھیں اور ان میں اپنے بیٹے کو پہچانا۔ ثریا نے بتایا کہ گاؤں کے مرد یہ فلمیں دیکھتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ گاؤں میں کیا ہورہا تھا یہ سب کچھ اس سے پہلے کا معاملہ ہے جب ابھی عورتوں کے علم میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

واضح سنائی دیتی تھیں۔

ٹیم نے ایک اور ایسے ہی بچے کی ماں سے بھی گفتگو کی۔ اس کی ماں نے ابھی تک ملزم کے خلاف کوئی باقاعدہ شکایت نہیں کی لیکن اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی جنسی درندگی کی ویڈیو دیکھ رکھی تھی۔ اس کا بیٹا اس وقت سترہ، اٹھارہ برس کا ہوچکا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے بیٹے کے ساتھ یہ درندگی چند برس تک کی جاتی رہی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ کئی ہزار روپے اس کے بیٹے سے وصول کئے گئے۔ ملزم میرے بیٹے کو بلیک میل کرتے اور اس کو دھمکیاں دیتے کہ اگر انہیں رقم نہ دی گئی تو وہ اس کی فلم گھر گھر میں چلائیں گے۔ اس خاتون نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے کئی بار گھر سے رقم چرا کر مجرموں کے حوالے کی۔ چوری کا پتہ چلنے پر گھر والے اس کی پٹائی کرتے لیکن یہ نہ جان سکے کہ وہ بار بار چوری کیوں کرتا تھا۔ اس سے سوال کیا کہ وہ مجرموں کے خلاف شکایت کیوں نہیں کراتی تو اس نے کہا کہ ان کے حامیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ احتجاج کے طور پر ایف آئی آر نہیں کرائی جائے گی۔ البتہ جب وزیراعلیٰ خود آکر ان سے بات کریں گے اور انہیں انصاف کی یقین دہانی کرائیں گے تو پھر وہ ایف آئی آر درج کرائیں گے۔

1۔ بچوں کے خلاف جنسی درندگی اور موضع حسین خان والا میں ہونے والے جُرم کا پیمانہ:

i۔ اس معاملے کے حوالے سے اسقدر مواد اور معتبر شہادتیں موجود ہیں جن سے نہ صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ مجرموں نے بچوں کی بڑی تعداد کے ساتھ جنسی درندگی کا ارتکاب کروانے کا جرم کیا بلکہ یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ یہ بہیمانہ عمل برسوں سے، کم ازکم 2010ء سے جاری ہے۔

ii۔ ٹیم نے ایف آئی آر میں درج بچوں کی عمروں اور اس بہیمانہ فعل کا شکار ہونے والے بچوں کو دیکھ کر ان کی عمروں کا جو اندازہ لگایا ہے ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ٹیم کے اندازے کے مطابق جب بچوں کے ساتھ درندگی کا یہ کھیل شروع ہوا، اس وقت ان کی عمریں دس سے سولہ برس کے درمیان تھیں۔

iii۔ ٹیم کا اندازہ ہے کہ بچوں کے ساتھ جنسی فعل کی کئی سو ویڈیو فلمیں بنائی گئی تھیں۔ تاہم یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ اس میں کتنے بچے ملوث تھے۔ اس معاملے میں کتنے بچوں کے خلاف جو جرم کیا گیا ہے، وہ تعداد جاننا اتنا اہم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان جنسی افعال میں ایک ہی گاؤں اور قریبی ہمسائیگی میں رہنے والے متعدد بچوں کو ملوث کیا گیا ہے۔

iv۔ پولیس کی طرف سے بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ آیا بچوں کے ساتھ بُرا فعل کیا گیا تھا یا انہوں نے بُرا فعل کیا تھا، ٹیم کے لئے یہ بات کچھ عجیب ہے۔ یہ بات صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے کہ جو فعل کیا گیا، اس کے بارے میں صرف ویڈیو فلمیں ہی انکشاف کرسکتی ہیں۔ بہرحال ٹیم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ بچوں کی عمروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس قسم کے عمل میں ان کی شمولیت کو ان لوگوں کی زیادتی اور زبردستی ہی جانا جائے گا جو اس عمل کی فلمیں بنا رہے تھے۔

v۔ ٹیم نے ذرائع ابلاغ کی کچھ رپورٹوں اور پولیس کے تبصروں کو بھی جانچا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ یہ سارا سکینڈل ہی جھوٹ پر مبنی ہے اور گاؤں کی ایک پارٹی نے گاؤں ہی کی دوسری پارٹی کے خلاف یہ معاملہ

گھڑا ہے جو سرکاری اراضی کے ایک ٹکڑے پر قبضہ کرنے کی خواہاں ہے۔ صاف اور واضح شہادت موجود ہے کہ اس گاؤں کے بچوں کے خلاف ایک بہیمانہ جرم کیا گیا چنانچہ اراضی کا تنازعہ ہی بے معنی ہوجاتا ہے۔ اور ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ واقعہ کی بھرپور تحقیقات کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ ان لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی جو اپنے مفادات کی خاطر اس سیکنڈل کو استعمال کررہے ہیں۔ تاہم یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ اس سے ظلم کے شکار بچوں کے خاندانوں کی درج کرائی گئی شکایات پر عملدرآمد متاثر نہ ہو اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ تحقیقات ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر ہو۔ چنانچہ اس ساری صورتحال کے پیش نظر ٹیم ضروری نہیں سمجھتی کہ اراضی کے معاملہ کو اس جرم کے ساتھ نتھی کیا جائے۔

2۔ بلیک میلنگ، بھتہ اور دھمکی دینے کے الزامات

i۔ ٹیم نے ظلم کے شکار بچوں اور ان کے خاندانوں میں سے معتبر شہادتیں سنیں اور ٹیم کو یقین ہے کہ یہ جرم اس لئے چھپا رہا کہ بھتہ کی رقم یا تو بچے ادا کرتے رہے یا پھر ان کے خاندان والے مجرموں کو ادا کرتے رہے۔

ii۔ رقم حاصل کرنے والے افراد کے نام سامنے نہیں آئے اور نہ ہی کسی ادائیگی کی تفصیلات ٹیم کے سامنے آئیں۔ تاہم ٹیم نے جن لوگوں کو انٹرویو کیا، ان سے یہ نام اگلوائے گئے۔ پولیس کے ساتھ اپنی گفتگو سے ٹیم نے یہ اخذ کیا کہ بھتہ وصول کرنے اور بلیک میلنگ کی کچھ شہادتیں موجود تھیں۔

iii۔ مجرموں کے خاندان والوں کی طرف سے شکایت کنندگان کی بے عزتی کرنے کے واقعات گاؤں کے بہت سے افراد نے بیان کئے اور شکایت کنندگان نے اس کی شکایت بار بار پولیس سے کی۔ بے عزت کرنے کی ایک ایف آئی آر مظلوم لڑکے کے چچا نے درج کروائی جس نے مجرموں کے خلاف اپنے بھتیجے پر ہونے والی زیادتی کے حوالے سے ایف آئی آر درج کروائی تھی۔

iv۔ ان میں سے اکثر نے پولیس کے خلاف بھی بے عزت کرنے کے الزامات لگائے۔ پولیس کا رویہ اس وقت زیادہ معاندانہ ہوگیا جب یہ سکینڈل عام ہوگیا۔

v۔ متعدد ذرائع نے ٹیم کو بتایا کہ گنڈا سنگھ والا کے ایس ایچ او نے شکایت کنندگان کی ایک موقع پر فلم بنائی جب وہ ملزموں کے خلاف اپنی شکایت درج کروانے آئے تھے اور یہ ویڈیو ملزم کے حوالے کردی تھی۔ ایس ایچ او کو لوگوں کی شکایت پر معطل کردیا گیا تھا۔

3۔ پولیس کی فرائض سے کوتاہی اور ملی بھگت، سازباز

i۔ گاؤں میں چلائی جانے والی ویڈیوز اور گردش کرنے والی افواہوں کو پھیلنے سے کون روک سکتا تھا۔ اس سکینڈل سے متعلق مقدموں کے اندراج سے مہینوں پہلے ایسا بہرحال نہیں تھا کہ پولیس ان ویڈیو فلموں اور افواہوں سے بے خبر تھی۔

ii۔ بشیراں والا واقعہ گاؤں کے بہت سارے لوگوں کے علم میں ہے اور یہ قابل یقین واقعہ ہے۔ یہ واقعہ پولیس کی ملی بھگت، اس کے سازباز اور دھوکہ دہی اور شکایت کنندگان کی ہونے والی بے عزتی اور ان پر کیا جانے والا تشدد روزمرہ کا معمول ہے جس کا نشانہ تھانوں میں عام لوگ روزانہ بنتے ہیں۔

iii۔ سابقہ ایس ایچ او شاہ ولی اللہ کا رویہ اور طرز عمل یقینی طور پر مشکوک تھا۔ ٹیم نے یہ بھی نوٹس کیا کہ پولیس سٹیشن کا عملہ ٹیم سے بات کرتے وقت بہت زیادہ محتاط تھا اور واقعہ کی تفتیش کے بارے میں مکمل اطلاع مہیا کرنے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا۔

iv۔ کیس کے حوالے سے مشکوک ہونے کا سب سے بڑا سبب وہ رپورٹ تھی جو جنسی درندگی کے واقعات کے بارے میں ''خفیہ اطلاع'' کے حوالے سے محرر نے تیار کی تھی لیکن اس کو غیر سنجیدگی کے ساتھ مسترد کردیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کا واحد مقصد یہ لگتا ہے کہ زمین کے تنازع کو ریکارڈ پر لے آیا جائے اور جنسی درندگی کے شکار بچوں اور ان کے خاندانوں کی درج کرائی گئی شکایات کو بے معنی کروادیا جائے۔ اس وقت بھی بچوں کی سنائی گئی خوفناک کہانیوں کے اثرات کو کم کرنے اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کروانے کے لیے یہی طریقہ استعمال کیا جارہا ہے۔

v۔ ٹیم نے نوٹس کیا کہ حقائق معلوم کرنے والے کمیشن کی آمد کے وقت تک پولیس نے موثر تفتیش سے خود کو دور رکھا۔ کسی گواہ پر جرح نہیں کی گئی اور جہاں جہاں بچوں کے ساتھ زیادتیاں کی گئیں ان مقامات سے کسی قسم کی شہادتیں اور کوائف اکٹھے نہیں کئے گئے۔ یہاں تک کہ وہ قابل اعتراض ویڈیوز جو گاؤں میں تقسیم کی جاتی رہی ہیں، انہیں تاحال ضبط تک نہیں کیا گیا۔

vi۔ پولیس شہادت حاصل کرنے اور اسے محفوظ نہ کرنے کے عمل کے بارے میں کوئی اطمینان بخش جواز نہیں دے سکی اور نہ ہی ان قابل اعتراض ویڈیوز کی گردش کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ بتاسکتی ہے۔ ایک ٹی وی چینل کو اس بہیمانہ جرم کے مقام تک رسائی حاصل تھی یعنی یہ چینل ملزموں کی حویلی کے اندر گیا اور اس جگہ کی فلم بنائی۔ یہ پولیس کی انتہائی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کا یہ رویہ غیر سنجیدہ ہے جس سے یقیناً تفتیش متاثر ہوتی ہے۔

4۔ سیاسی اثر ورسوخ اور پولیس کی تفتیش میں مداخلت:

i۔ ٹیم نے متعدد افراد کی شکایت سنی کہ مقامی سیاستدان معاملے کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے پولیس پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بہرحال یہ شکایت کسی ایک شخصیت کے حوالے سے نہیں تھی۔ ذرائع ابلاغ سے متعلق چند افراد نے کہا کہ ایک مقامی ایم پی اے مجرموں کی مدد کررہا ہے اس لئے کہ مجرموں میں سے چند ایک اس کے عزیز ہیں یا اس کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹیم اس حوالے سے کوئی ٹھوس ثبوت حاصل نہیں کرسکی جس سے ٹیم یہ کہہ سکے کہ کسی ایک فرد یا گروپ کو مجرموں کے حق میں سیاسی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ii۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ پولیس کا رویہ اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے بعض رہنماؤں کے بیانات نے ایسا تاثر قائم کیا جیسے یہ لوگ اپنے عہد سے مکر گئے ہوں اور وہ ظلم کے شکار بچوں اور ان کے خاندانوں کو

کیس کے حوالے سے مشکوک ہونے کا سب سے بڑا سبب وہ رپورٹ تھی جو جنسی درندگی کے واقعات کے بارے میں ''خفیہ اطلاع'' کے حوالے سے محرر نے تیار کی تھی لیکن اس کو غیر سنجیدگی کے ساتھ مسترد کردیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کا واحد مقصد یہ لگتا ہے کہ زمین کے تنازع کو ریکارڈ پر لے آیا جائے اور جنسی درندگی کے شکار بچوں اور ان کے خاندانوں کی درج کرائی گئی شکایات کو بے معنی کروادیا جائے۔ اس وقت بھی بچوں کی سنائی گئی خوفناک کہانیوں کے اثرات کو کم کرنے اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کروانے کے لیے یہی طریقہ استعمال کیا جارہا ہے۔

انصاف دلانے میں سنجیدہ اور مخلص نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر رانا ثناءاللہ نے پورے واقعہ ہی کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ مفاد پرست افراد نے زمین کے تنازعہ کو یہ رنگ دے کر صورتحال کو بگاڑ دیا ہے۔

iii۔ ٹیم نے میڈیا کے کچھ لوگوں کی آراء کا بھی نوٹس لیا ہے جن کے مطابق ظلم کے شکار خاندانوں کے اردگرد جمع ہونے والوں کی شہرت اور معتبری زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے لوگوں کی سیاسی وابستگی خصوصاً ایک خاص مذہبی گروہ کے ساتھ وابستگی کا ذکر کیا ہے۔

iv۔ بظاہر یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس کو سیاسی رنگ دے کر اچھالا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ متاثرہ خاندانوں کے افراد کی بجائے مظاہروں کے بارے میں فیصلہ سیاسی جماعتوں سے متعلق لوگ کرتے لیکن اپنی شکایات کے حوالے سے معاملات کا جائزہ خود ان لوگوں ہی نے لیا۔ تاہم کچھ فیصلے متاثرہ خاندانوں سے ہٹ کر دوسرے لوگوں نے لئے۔ مثال کے طور پر وزیراعلیٰ کے گاؤں میں آنے کا مطالبہ متاثرہ خاندانوں نے نہیں کیا تھا بلکہ ان کے نام نہاد حمائتیوں نے کیا تھا۔

v۔ ٹیم نے سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادت کے کردار کو پریشان کن پایا۔ ٹیم نے کچھ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو یہاں دیکھا۔ ان سب نے یہاں پر صوبائی حکومت کے خلاف کافی زہر اگلا۔ انہوں نے بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ان کے استحصال کو روکنے اور بچوں کو تحفظ دینے کی ضرورت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ان میں سے کوئی ایک ایسا نہیں تھا جس نے اپنی طویل تقریروں میں اس سماجی مسئلہ پر کوئی بات کی ہو اور نہ ہی یہ ذکر کیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی اقدام کریں گے۔ ٹیم کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی پولیس سے نہیں ملا تا کہ تفتیش کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔

> یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس کو سیاسی رنگ دے کر اچھالا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ متاثرہ خاندانوں کے افراد کی بجائے مظاہروں کے بارے میں فیصلہ سیاسی جماعتوں سے متعلق لوگ کرتے لیکن اپنی شکایات کے حوالے سے معاملات کا جائزہ خود ان لوگوں ہی نے لیا۔

vi۔ ٹیم ان کے بارے میں یہی کہہ سکتی ہے کہ ان کا مقصد اس صورتحال کو حکومت کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ کسی سیاسی رہنما نے اس گاؤں کا نہ تو دورہ کیا اور نہ ہی ظلم کے شکار خاندانوں کو انصاف دلانے کی یقین دہانی کرائی۔

5۔ ظلم کے شکار بچوں کی صورتحال:

i۔ ٹیم اس نتیجے پر پہنچی کہ جسمانی اور نفسیاتی ردعمل کو نظرانداز کرنے سے متاثرہ بچوں پر ہونے والے اثرات اذیت ناک ہوسکتے ہیں۔

ii۔ ان کے والدین سمیت کسی نے بھی ٹیم کے سامنے اس حوالے سے تشویش کا اظہار نہیں کیا۔

iii۔ ٹیم کے ارکان تجویز کرتے ہیں کہ ان بچوں کو مناسب طبی امداد اور نفسیاتی مشاورت مہیا کی جائے۔ ان بچوں کے گھر والوں کی طرف سے ان کو ایسی توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی ان بچوں کے گھر والے ملزموں کے خلاف انصاف حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

iv۔ گاؤں میں اس مسئلہ پر کوئی گفتگو اور بحث مباحثہ نہیں ہو رہا تھا کہ ایسے جرائم کو روکنے کے لئے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

v۔ ان بچوں کی بحالی کے لئے نہ کسی این جی او کی خدمات حاصل کی گئیں اور نہ ہی اس قسم کے واقعات میں مدد مہیا کرنے والے ماہرین سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اور نہ ہی کوئی ادارہ اپنے طور پر گاؤں میں آ کر یہ خدمت سرانجام دینے کے لئے آگے بڑھا ہے۔

سفارشات

مزید کارروائی:

☆ تفتیش کی مانیٹرنگ۔ ایک ہفتے بعد جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم (JIT) سے ملاقات۔

☆ چالان کے داخل ہونے تک مقدمے کی پیروی۔

☆ موضع حسین خان والا کا دورہ تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ تفتیش اطمینان بخش طور پر آگے بڑھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ یہ دیکھنا کہ مظلوموں کی بے عزتی کرنے کے حوالے سے صورتحال اب کیسی ہے۔

☆ غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کا تعاون حاصل کرنا اور گاؤں میں ان بچوں کے لئے جسمانی اور نفسیاتی معالجین کا حصول۔

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا جو خامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔
- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/ اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔
- ہر شمارہ کی قیمت مبلغ =/5 روپیہ ہے
- سالانہ خریداروں کے لیے =/50 روپیہ ایسے خریدار پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (Human Rights Commission of Pakistan) کے نام صرف =/Rs.50 کا منی آرڈر یا ڈرافٹ (چیک قبول نہیں کیا جائے گا) ہمارے ہیڈ آفس کے پتہ پر روانہ کریں۔ پتہ یہ ہے:

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تا کہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے اب ویب سائٹ پر بھی موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

پاکستان میں حفاظتی قوانین کی صورتحال

کراچی پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کراچی چیپٹر نے ''پاکستان میں حفاظتی قوانین کی صورتحال'' کے عنوان پر ایک سیمینار منعقد کیا۔ جس میں انسانی حقوق کے سرگرم کارکنوں، ٹریڈ یونین رہنما مزدوروں، اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔

میٹنگ کے مقرر جناب محمد نفیس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں ریسرچ کا کام کرنے والوں کو سہولیات نہیں دی جاتی اور اس کام کو اہم بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ سیاسی محرکات بھی ہیں جو اس عمل کو ناکام بنا رہے ہیں۔ ان معاملات کے ساتھ ساتھ بیرونی ہاتھ، غربت، غیر تسلی بخش تعلیمی اعداد و شمار، افغان طالبان اور انتہا پسند طالبان ایسے محرکات ہیں جو اس سارے عمل کی کامیابی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سال 2014ء کے ہمارے پاس اعداد و شمار ہیں جس میں ہلاکتیں نہیں ہوئیں۔ میں اس مسئلے کو اس حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ سال 2013ء میں سکیورٹی اداروں کو سہولیات کم دی گئیں تھیں جبکہ 2014ء میں سہولیات بڑھائی گئیں ہیں۔ ضلعی لحاظ سے کراچی میں فوجی آپریشن ہوا ہے۔ یہاں پر تشدد کا رجحان زیادہ ہے۔ میرے اعداد و شمار کے مطابق اگر شہری علاقے ہیں تو وہاں پر تعلیم کا رجحان نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی تشدد کا رجحان زیادہ کیوں ہے؟

خود کش حملوں کا تناسب صوبہ پنجاب میں زیادہ ہے، جہاں پر اموات بھی بہت ہوئی ہیں۔ مختلف جگہوں پر حملوں کا طریقہ کار بھی مختلف ہے۔ سکیورٹی آپریشن فاٹا اور پنجاب میں زیادہ ہے جہاں پر بم دھماکے ہوئے اور ان کے خلاف جدید اسلحہ استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں پولیس کے اہلکاروں کی اموات زیادہ ہوئی ہیں جبکہ گزرے سال میں فوجی اہلکاروں کی ہلاکت زیادہ ہوئی تھیں۔ ایسے واقعات سے کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے، حکومتی ادارے، اسٹیشن، مارکیٹیں، مساجد، امام بارگاہ میں اور چرچ وغیرہ پاکستان میں بسنے والا ہر شہری اس کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب، فرقے یا زبان سے ہو کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں مختلف اداروں کے بہت سے ایجنٹ کام کر رہے ہیں اور اگر ایجنٹ کام کر رہے ہیں تو کیا کام کر رہے ہیں۔ حالات میں بہتری کیوں نہیں آ رہی؟ کیا یہ ادارے اپنی ذمہ داری بہتر طور پر نہیں نبھا رہے؟ ٹارگٹ کلنگ میں بہت سے لوگوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور سیاسی جماعتوں کے لوگوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور تشدد صرف کسی ایک گروہ یا طبقے کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم کے لیے نقصان دہ ہے۔ چھوٹی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کو بھی خطرات لاحق ہیں۔

بہت سے مذہبی لوگوں کو جن کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے اور وہ مختلف عقیدوں کو مانتے ہیں ان لوگوں کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ بہت سے واقعات ایسے ہیں جو مختلف مذہبی مقامات پر پیش آئے ہیں کچھ فرقے ایسے بھی ہیں جن کے گروہ بنے ہوئے ہیں اور وہ دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔

بہت سے مذہبی لوگوں کو جن کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے اور وہ مختلف عقیدوں کو مانتے ہیں ان لوگوں کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ بہت سے واقعات ایسے ہیں جو مختلف مذہبی مقامات پر پیش آئے ہیں کچھ فرقے ایسے بھی ہیں جن کے گروہ بنے ہوئے ہیں اور وہ دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے لوگوں میں منفی پروپیگنڈہ پھیلا کر انہیں آپس میں لڑاتے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والی بہت سی برادریاں ان مسائل کا شکار ہیں۔

پاکستان میں بسنے والے لوگوں میں منفی پروپیگنڈہ پھیلا کر انہیں آپس میں لڑاتے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والی بہت سے برادریاں ان مسائل کا شکار ہیں۔

2014ء میں خواتین سمیت بچوں کو بھی دہشت گردی کے واقعات کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا۔ اور ایک بہت بڑی تعداد ایسے واقعات سے متاثر ہوئی۔ پاکستان میں بیرونی ممالک سے آنے والے بہت سے غیر ملکی باشندے بھی دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ پہلے اسماعیلی برادری اور بوہرہ برادری ایسے واقعات کے شکار نہیں ہو رہے تھے لیکن اب ان برادریوں کو بھی دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تشدد کے رجحان کے حوالے سے ملک کے کئی شہروں میں یہ مسئلہ کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم ہو جاتا ہے۔ پاکستانی قوم میں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ جب بھارت کی جانب سے حملہ ہوتا ہے تو پوری قوم ایک ہو جاتی ہے جبکہ آئے دن ملک میں ہونے والے دھماکوں پر قوم کا ردعمل اتنا جاندار نظر نہیں آتا۔ جتنا ہونا چاہئے۔ ہمارے ملک میں ہم تعلیمی سہولیات بڑھانے کے بجائے خوف بڑھا رہے ہیں۔ سکول، کالج، یونیورسٹیوں میں خوف کا ماحول ہے۔ علم حاصل کرنے کے رجحان میں کمی آ رہی ہے۔ اگر بچے خوف کے عالم میں سکول نہیں جائیں گے تو ملک سے ناخواندگی کا خاتمہ کیسے ہوگا اور حالات کیسے بہتر ہوں گے؟

پاکستان میں موجود دہشت گردی کے حالات کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں کہ سب ہی اس کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اس ملک کے مسلمانوں، غیر مسلموں اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ عام آدمی سب سے زیادہ ان مسائل کا شکار ہے۔ ہمیں عام لوگوں کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو مثبت باتوں کے ساتھ ساتھ انسانیت کے لیے خدمات کا درس دینا ہوگا۔ اور یہ بھی سمجھانا ہوگا کہ یہ لڑائی ہماری اور تمہاری لڑائی نہیں بلکہ سب کی لڑائی ہے۔ ان حالات سے نقصان تمام انسانوں کا ہی ہوتا ہے۔ ایسے حالات بدلنے کی بہت ضرورت ہے۔ جس پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا اور ایک بہتر سماج کے حصول کے لیے اس خطے میں بسنے والے ہر فرد کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

سینٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی اسٹڈیز نے اپنے سہ ماہی رپورٹ پیش کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ رپورٹ پیش کرنے کا مقصد حقائق پیش کرنا ہے۔ دہشت گردوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی ہے کہ ایسے لوگ جو اس ملک میں کسی مسئلے میں حصہ دار بنے ان کو مار دیا گیا، اب انہوں نے عورتوں اور بچوں کو مارنا شروع کر دیا ہے۔ ان اعداد و شمار کا مقصد یہ ہے کہ ان کی روشنی میں مسائل کی بہتر انداز میں نشاندہی کی جائے۔ ہم ایسے علاقوں میں کام کرتے ہیں جہاں پر لوگ معاشی طور پر کمزور ہیں۔ کئی زیادہ تر دیہی اور قبائلی علاقے ہیں۔ اس کے علاوہ مڈل کلاس اور ایسے علاقے بھی ہیں جہاں پر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ نظریاتی اختلافات پورے ملک میں ہیں۔ عام لوگوں کو مختلف انداز سے ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اس تمام صورتحال کے بعد پورے ملک کو متحد ہو کر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے پچھلے دنوں ایک سہ ماہی رپورٹ تیار کی تھی جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ ہم انسان مکمل امن و امان کی صورتحال کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قیام امن کے لیے ہمیں بہت کام کرنا ہوگا۔

جناب اسد اقبال بٹ نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کراچی کے سلسلے وار معلوماتی ماہانہ نشست کے بارے میں کہا کہ ان نشستوں کے انعقاد کا مقصد عام لوگوں کو مختلف مسائل کے حوالے سے آگاہی دینا ہے۔ میٹنگ میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کراچی کے سینئر رہنما عبدالحی نے بھی شرکت کی۔

(روبن شریف)

یوم آزادی پر سوچ بچار

آئی۔اے۔رحمان

قصور کے توہین آمیز واقعہ نے ریاستی بگاڑ کے چند بنیادی اسباب کو منکشف کر دیا ہے

روایت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یوم آزادی ایک تہوار ہے اور اس روز جشن منایا جاتا ہے لیکن یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کل جب یہ رسمی ورواجی جشن اور میلے ٹھیلے ختم ہو جائیں گے تو پھر لوگ کیا کہیں گے۔ کیا سوچیں گے، کس قسم کے ردعمل کا اظہار کریں گے۔

کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس سفاک اور غارت گر انتظامیہ کا کیا کیا جائے جس نے دارالحکومت کی بیس سالہ پرانی کچی آبادی پر بلڈوزر چلا کر سینکڑوں خاندانوں کو بے گھر ، بے در کر دیا ہے۔ ہزاروں افراد حیران و پریشان ہیں کہ اگر حالیہ سیلاب کے دوران انتظامیہ زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دیتی تو ان کی املاک کو پہنچنے والے نقصان کی شدت میں کمی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ 2010ء سے تو سیلاب ہمارے لئے سالانہ ابتلاء اور آزمائش بن چکے ہیں۔

یوم آزادی سے اگلے دن کا زیر بحث گرما گرم موضوع قصور کا واقعہ ہوگا جس کا تعلق سینکڑوں بچوں کے ساتھ ہونے والی جنسی درندگی سے ہے اور جس نے ریاستی بگاڑ کے چند بنیادی اسباب کو واشگاف کر دیا ہے۔ اس ہولناک واقعہ کے بعد طرز حکمرانی میں سامنے آنے والا پہلا بگاڑ یہ ہے کہ پنجاب حکومت نے انحراف اور انکار کے طریقہ میں پناہ لی۔ صوبائی وزیر قانون نے ناقابل معافی وحشیانہ عمل پر جس تمسخرانہ طریقے سے ردعمل کا اظہار کیا وہ حیلہ طرازی اور دوغلے پن کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ حق کے طور پر بطور وزیر وہ اس واقعہ سے ہی انکار کر دیتے اس لئے کہ حکومت ایسی ہر سماجی برائی کے وجود سے انکار کرنے کی عادی ہے جس پر وہ قابو پانے میں ناکام رہتی ہے۔ چاہے مسئلہ بچوں کی مشقت کا ہو، خواتین کے خلاف تشدد کا ہو، اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا معاملہ ہو یا جبری طور پر افراد کو غائب کرنے کا مسئلہ، حکومت کا پہلا ردعمل صاف انکار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اب تک تو حکام کو اس قیمت کا اندازہ لگا لینا چاہئے تھا جو ان کے انکار اور انحراف کی پالیسی پر تسلسل کے ساتھ کاربند رہنے کے باعث ملک کو چکانی پڑی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ غلط دعووں اور بے بنیاد وعدوں کے ذریعے غلطی یا ناکامی کو چھپانے کے لیے بے معنی حقائق اور اعداد و شمار گھڑنے پڑتے ہیں۔ آخر کار سچ کو تو ماننا ہی پڑتا ہے لیکن اس کا کیا فائدہ کہ سچ ماننے میں قیمتی وقت کو ضائع کیا جائے۔ قصور کے واقعہ ہی کو لیجئے، اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوا حالانکہ اس کو چند گھنٹوں ہی میں مان لینا چاہئے تھا۔

اس واقعہ نے جس دوسرے مسئلہ کو اجاگر کیا، وہ ہے حکومت کی طرف سے بچوں کے حقوق پر مناسب توجہ دینے میں مسلسل ناکامی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبائی حکومتوں نے بچوں کے بہتر تحفظ کے حوالے سے کچھ اقدامات کئے ہیں اور آئین میں آرٹیکل 25۔اے کے شامل ہونے کے بعد تعلیم کو بچوں کے بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس سے خوشی اور انبساط کا جو احساس پیدا ہوا تھا، اس میں کمی نہیں آئی۔ لیکن یہ حقیقت تکلیف دہ ہے کہ پاکستان اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی کی سفارشات پر تاحال عمل درآمد نہیں کر پایا یا کمیٹی سے کئے گئے وعدوں پر عملدرآمد نہیں کر پایا۔ ان کے علاوہ 2012ء کا ہمہ گیر معیاری جائزہ برائے سال 2012ء (یونیورسل پیریاڈک ریویو 2012ء) کے مطابق جس طرح بچوں کے حقوق کے حوالے سے رویہ اختیار کیا گیا، وہ ڈھکا چھپا نہیں تھا لیکن اس پر گفتگو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو محض ایک جرم کے طور پر لینے اور اسی حوالے سے سزا دینے کا رجحان حکومت کی تیسری ناکامی ہے۔ جب بھی بچے کا انسانی وقار تار تار ہوتا ہے تو اسی وقت قانون کو تو حرکت میں آ ہی جانا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی ظلم کے شکار بچے کو اس جذباتی صدمے اور ذہنی سراسیمگی سے باہر نکالنے اور آئندہ ایسے عمل کے دوہرائے جانے کو روکنے کے اقدامات کی یقین دہانی بے حد ضروری ہے۔ چند برس قبل ایک ایسے ہی بھیڑیے نما انسان پر مقدمہ چلایا گیا تھا جس نے اپنی بے راہ روی کے شکار سو بچوں کی لاشوں کو تیزاب میں ڈال کر تحلیل کر دیا تھا۔ اس واقعہ پر بہت شور مچا اور لاوارث بچوں کے لیے تحفظ کے لیے قانون بنانے کا ہر طرف سے مطالبہ کیا گیا۔ مطالبہ کیا گیا کہ اس قانون کے تحت پولیس کو ان بچوں کی دیکھ بھال کرنے، ان پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ عدالت اسے سزا سناتی، جیل ہی میں مجرم کی موت واقع ہو گئی اور کچھ ہی عرصے بعد لوگ اس واقعے ہی کو بھول گئے۔

> صوبائی وزیر قانون نے ناقابل معافی وحشیانہ عمل پر جس تمسخرانہ طریقے سے ردعمل کا اظہار کیا وہ حیلہ طرازی اور دوغلے پن کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ حق کے طور پر بطور وزیر وہ اس واقعہ سے ہی انکار کر دیتے اس لئے کہ حکومت ایسی ہر سماجی برائی کے وجود سے انکار کرنے کی عادی ہے جس پر وہ قابو پانے میں ناکام رہتی ہے۔ چاہے مسئلہ بچوں کی مشقت کا ہو، خواتین کے خلاف تشدد کا ہو، اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا معاملہ ہو یا جبری طور پر افراد کو غائب کرنے کا مسئلہ، حکومت کا پہلا ردعمل صاف انکار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

کیا حکام اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ موجودہ معاملے میں وہی کہانی نہیں دوہرائی جائے گی؟ کیا بچوں کے ساتھ زیادتی کے معاملے سے نمٹنے کے لئے کوئی میکانزم یا ڈھانچے کو مضبوط کیا جائے گا؟ کیا قصور کے واقعہ سے متعلق بچوں کو نفسیاتی طور پر صحیح رکھنے کے لئے نفسیاتی معالجوں کی خدمات حاصل کی جائیں گی؟

ایک اور ناکامی بھی ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس قسم کے شیطانی گروہوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہیں جو برسوں سے سماج کو تباہی کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ جس واقعہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ بھارتی سرحد کے قریب ایک پاکستانی گاؤں میں ہوا ہے جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ متحرک ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے شرمناک معاملے سے بے خبر رہی ہوں؟

وہ جو سرکاری رہنماؤں کی طرح اتوار (9 اگست) کی صبح کو قصور والی کہانی سے واقف ہوئے ہیں اور وہ بھی میڈیا کے اچھالنے کے باعث، وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہے ہوں گے کہ آخر اس ظلم و ستم کا نشانہ بننے والوں کے خاندان برسوں تک اس المیہ پر خاموش کیوں رہے؟ ان میں سے کچھ خاندانوں نے بظاہر خاموش رہنے میں بہتری سمجھی اور وہ بلیک میلنگ کی رقم بھی ادا کرتے رہے۔ ان لوگوں نے ایسا انداز کیوں اختیار کیا، اس کی جانچ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ آخر عام دیہاتی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا قانونی تدارک کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے؟ کیا وہ پولیس پر اپنا اعتماد کھو چکے ہیں؟

ہو سکتا ہے کہ ابتدائی طور پر ایسا لگے جیسے ظالموں کی اطاعت نے ان بے سہارا دیہاتیوں کے ذہنوں کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا ہے یہاں تک کہ اپنے حقوق کے بارے میں ان کے ذہنوں میں کوئی تصور ہی نہ بچا ہو اور نہ ہی ان کے اندر ناانصافی کے خلاف مزاحمت کا احساس باقی رہ گیا ہو۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھلے کتنی کم ہی کیوں نہ ہو، یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ یہ احساس انہیں واپس دلائے کہ ان کی زندگیوں اور مال واموال کا تحفظ یقینی طور پر حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس ہولناک واقعہ کی حکومت کے نوٹس میں لانے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ظلم کے شکار تمام لوگ خاموش نہیں رہے۔ اس اخبار نے کچھ عرصہ پہلے قصور کے گاؤں میں بچوں کے ساتھ منظم طریقے سے کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں خبر شائع کی تھی۔ 5 اگست کو یعنی اس دن سے چار روز قبل جب پنجاب حکومت بے حسی کی نیند سے میڈیا کے شور و غوغا سے اس وقت جاگی جب اس اخبار اور دوسرے اخبارات نے مظاہرین اور پولیس کے درمیان ہونے والے تصادم کی خبریں شائع کیں۔ اس تصادم میں دو ڈی ایس پی افسروں سمیت بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ خبر میں بتایا گیا کہ بچوں کے ساتھ جنسی درندگی کا کھیل منظم طریقے سے 2009ء سے کھیلا جا رہا تھا۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ چند والدین بلیک میلنگ کے سامنے جھک گئے اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس جرم میں ملوث چند افراد گرفتار بھی کئے جا چکے ہیں لیکن لاہور یا اسلام آباد میں حکومت کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اتنا کافی نہیں تھا۔

آخری سوال یہ ہے کہ:

بچوں کی معصومیت پر کتنا بڑا حملہ ہونا ضروری ہے کہ جس سے بڑے اور طاقتور لوگوں کے ضمیر جاگ اٹھیں اور وہ اپنے ریشمی خول سے باہر نکل پائیں؟

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

جب پولیس افسر فرض شناس ہوں

حفیظ احمد بزدار

''آپ کو اس جوڑے کی ہر صورت جان بچانی ہے چاہے اس کے لئے آپ کو کچھ بھی کرنا پڑے''۔ یہ الفاظ DPO شیخوپورہ سہیل ظفر چٹھہ کے تھے جو اپنے ساتھی آفیسرز ایس پی جواد اور اے ایس پی زبیر سے بات کر رہے تھے۔ اصل واقعہ کیا تھا؟ کیسے ہوا؟ چٹھہ صاحب کے الفاظ جو انہوں نے اپنے Face Book صفحہ پر لکھے:

"آج شیخوپورہ پولیس نے بروقت کاروائی کر کے ایک بہت بڑے انسانی سانحے کو رونما ہونے سے روک لیا۔ ایک غریب اور ان پڑھ مسیحی جوڑے نے ایک ایڈورٹائزنگ بورڈ کو جس پر مختلف کالجز اور یونیورسٹیز کے لوگو بنے ہوئے تھے سونے کی غرض سے بطور قالین بچھا لیا۔ علاقہ کے لوگوں نے جھوٹا الزام لگایا کہ بورڈ پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں اور یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی۔ مسیحی جوڑے کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور ان پر بدترین تشدد کیا گیا۔ جبکہ ان کو معلوم تک نہ تھا کہ انہیں کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ ایس پی جواد اور اے ایس پی زبیر مجھ سے پہلے اس جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ میری ان کو واضح ہدایات تھیں کہ ہر صورت مسیحی جوڑے کو بچایا جائے چاہے اس کے لئے آپ کو ہجوم پر فائر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ان دونوں مسیحی افراد کو معجزانہ طور پر بچا لیا گیا اور فوری طور پر محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ جس مولوی نے لوگوں کو اکسایا اور یہ تمام ڈرامہ تشکیل دیا اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ ہم پر اس مسیحی جوڑے کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا۔ بعد ازاں مسیحی جوڑے کو لاہور کی ایک کرسچین تنظیم کے حوالے کر دیا گیا"۔

" آج شیخوپورہ پولیس نے بروقت کاروائی کر کے ایک بہت بڑے انسانی سانحے کو رونما ہونے سے روک لیا۔ ایک غریب اور ان پڑھ مسیحی جوڑے نے ایک ایڈورٹائزنگ بورڈ کو جس پر مختلف کالجز اور یونیورسٹیز کے لوگو بنے ہوئے تھے سونے کی غرض سے بطور قالین بچھا لیا۔ علاقہ کے لوگوں نے جھوٹا الزام لگایا کہ بورڈ پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں اور یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی۔ مسیحی جوڑے کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور ان پر بدترین تشدد کیا گیا۔ جبکہ ان کو معلوم تک نہ تھا کہ انہیں کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ ایس پی جواد اور اے ایس پی زبیر مجھ سے پہلے اس جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ میری ان کو واضح ہدایات تھیں کہ ہر صورت مسیحی جوڑے کو بچایا جائے چاہے اس کے لئے آپ کو ہجوم پر فائر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ان دونوں مسیحی افراد کو معجزانہ طور پر بچا لیا گیا اور فوری طور پر محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ جس مولوی نے لوگوں کو اکسایا اور یہ تمام ڈرامہ تشکیل دیا اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ ہم پر اس مسیحی جوڑے کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا۔ بعد ازاں مسیحی جوڑے کو لاہور کی ایک کرسچین تنظیم کے حوالے کر دیا گیا"۔

چٹھہ صاحب کے اس اقدام نے نہ صرف مسیحی جوڑے کی جان بچائی بلکہ انسانی حقوق کے لیے مثال بھی قائم کی۔ آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

☆ سب سے پہلے تو ہم عصر پولیس افسران اور مجموعی طور پر پولیس ڈیپارٹمنٹ کے فرض شناس لوگوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے کہ اگر افسر جرأت مند ہو تو بڑا ہجوم بھی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔

☆ دوسرا سبق یہ کہ اگر مشتعل ہجوم ہی زندگی موت کے فیصلے کرنے لگے تو پھر پولیس سٹیشن اور عدالتیں کس کام کی، پھر ملزم سے مجرم تک کا تعین کیونکر ہوگا۔ پھر تو بہت آسانی سے کوئی بھی بااثر شخص یا گروہ نام نہاد مولویوں کے ذریعہ توہین مذہب کے نام پر اپنے مخالفین کو ہجوم کے ہاتھوں مروا دے۔

☆ تیسرا سبق یہ کہ وہ تمام حضرات جو توہین مذہب کے قانون کو اپنے ذاتی مقصد کے لئے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں ان کے لئے پیغام یہ ہے کہ وہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے کئی بار سوچیں۔

☆ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس اقدام سے اقلیتوں کو بہت حوصلہ ملے گا۔ یقیناً جس ضلع میں ایسے آفیسرز ہوں وہاں نہ صرف اقلیتیں خود کو محفوظ سمجھیں گی بلکہ اس بات کا احساس پیدا ہوگا کہ وہ بھی اس ملک میں برابر کے شہری ہیں۔

☆ اور جب ہندوستان کی اخبار Times of India نے چٹھہ صاحب کی خبر چھاپی اور ان کی بہادری کو سراہا تو ایک طرح سے یہ ہمارے ملک کے کچھ پولیس افسران کو خراج تحسین تھا۔

کیا وہ وقت نہیں آ گیا کہ ہم بادامی باغ کے سانحہ کو مندرجہ بالا تناظر میں دیکھیں جہاں سینکڑوں گھر توہین مذہب کے الزام کی آڑ میں جلا دئے گئے اور بعد میں معلوم ہوا اصل جھگڑا تو پراپرٹی کا تھا۔ اسی طرح گوجرانوالہ میں ایک شخص کو جلا دیا گیا بعد میں معلوم ہوا وہ تو جماعت اسلامی کا بہت سینئر کارکن تھا اور مقامی امام مسجد کی اشتعال انگیزی کا شکار ہوا۔

ایک نہیں درجنوں ایسے واقعات ہیں جب مشتعل ہجوم نے بغیر تحقیق بغیر تصدیق انسانوں کو زندہ جلا دیا، گھروں کو نذر آتش کر دیا اور بعد میں معلوم ہوا اصل حقائق کچھ اور تھے۔ ایک لمحہ کے لئے سوچئے کیا اس طرح کے واقعات سے دوسرے ممالک کے لوگ ہمیں انتہا پسند سمجھنے میں حق بجانب نہیں؟ کیا پھر بھی وہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کرنے آئیں گے؟

میرا ان تمام لوگوں سے ایک سوال ہے جن کی آنکھوں کے سامنے شمع بی بی، اس کے پیٹ میں معصوم بچے اور اس کے شوہر کو بھٹے میں زندہ جلا دیا گیا۔ جو لوگ تماشائی بن کر دیکھتے رہے اور بعد میں معلوم ہوا اصل تنازعہ توہین مذہب کا نہیں بلکہ لین دین کا تھا۔ اس واقعہ کے چشم دید لوگ کیا خود کو اس انسانیت سوز قبیح فعل میں برابر کا شریک نہیں سمجھتے؟ کیا ان میں سے کسی نے اس نام نہاد مولوی کے اعلان کی تصدیق کی؟ کیا کسی نے آگے بڑھ کر زندہ انسانوں کو جلانے والوں کو روکنے کی کوشش کی؟ یہ کون سا اسلام ہے؟

اگر ایمان داری سے دیکھا جائے تو توہین مذہب کے حوالے سے امام مسجد کی طرف سے اعلان ہی سارے اشتعال، ساری گڑبڑ کا محور ہوتا ہے۔ وہ اعلان دراصل اطلاع نہیں، اعلانِ جنگ ہوتا ہے ملزم کے خلاف، شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے والوں کے خلاف اس چیز کا تعین تو پولیس کرے گی، عدالت کرے گی کہ توہین مذہب کا کیس بنتا بھی ہے کہ نہیں۔ اگر ملزم کے جرم کی نوعیت کا تعین بھی مشتعل ہجوم کرے، سزا جزا کا فیصلہ اور نفاذ بھی ہجوم کرے تو پھر ریاست کے ادارے، پولیس سٹیشن، عدالتیں اور جج یہ سب تو بے معنی ٹھہرے۔

اگر مساجد کے امام اس طرح کی صورت حال میں اعلان کرنے کی بجائے پولیس کو مطلع کریں کی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا ہوں تو پھر اس طرح کے معاملات کا فیصلہ عدالتیں کریں گی نہ کہ ہجوم۔ مساجد کے ایسے امام جو اس حوالے سے مثبت کردار ادا کریں ان کو نہ صرف پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے سراہا جائے بلکہ میڈیا بھی اس مثبت کردار کی تحسین کرے تا کہ اچھی مثالیں قائم ہوں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو متعلقہ امام مسجد اس اعلان کی بدولت پولیس کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ کیونکہ اس اعلان کی بدولت جب ہجوم مشتعل ہو جاتا ہے تو پولیس ملزمان کو بچانے کے لئے اگر وہ ہجوم کی زد سے بچ گئے ہوں نہ صرف تحویل میں لے لیتی ہے بلکہ عوامی دباؤ میں آ کر ملزمان کے خلاف ایف آئی آر درج کر دیتی ہے۔ اور جب ایک بار توہین مذہب کی ایف آئی آر درج ہو جائے تو آپ بھلے سو فیصد بے گناہ ہوں آپ کی زندگی عذاب بن جائے گی۔ بقول ڈاکٹر مہدی حسن اس نوعیت کے اب تک دو ہزار سے زائد مقدمات درج ہو چکے ہیں جن میں اکثریت مسلمانوں کے ایک فرقے نے دوسرے کے خلاف کرائے۔ اگر اعلان نہ کیا جائے اور پولیس کو اطلاع کی جائے تو پولیس کے لئے بہت آسان ہو جائے اس بات کا تعین کرنا کہ ایف آئی آر الزام لگانے والے کے خلاف درج ہونی چاہئے یا کہ الزام لگنے والے کے خلاف۔ اس طرح نہ صرف ایسے واقعات کی حوصلہ شکنی ہوگی بلکہ امام مسجد صاحب مشتعل ہجوم کی وساطت سے پولیس پر اثر انداز بھی نہیں ہو سکیں گے۔

سہیل ظفر چٹھہ، ایس پی جواد، اے ایس پی زبیر اور وہ تمام پولیس اہلکار جنہوں اس آپریشن میں حصہ لیا اور مسیحی جوڑے کی جان بچائی ان کی فرض شناسی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسے لوگ اپنے ڈیپارٹمنٹ یا اپنے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ قوم کے لئے باعث فخر ہیں۔ ان کا یہ عمل اس آیت کی عملی تفسیر ہے جس میں کہا گیا "جس نے ایک انسان کی جان بچائی گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی."

اگر پولیس امام مساجد سے "اعلان نہیں اطلاع" کی پالیسی پر کسی طور عمل کرا لیتی ہے تو آپ یقین کیجئے یہ ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا جس میں پھر کوئی کوٹ رادھا کشن جیسا، کوئی گوجرہ جیسا، بادامی باغ جیسا سانحہ نہیں ہوگا۔ جس میں پھر کوئی شمع سرعام آگ میں نہیں جلے گی۔ جس میں پھر فیصلے ہجوم نہیں عدالتیں کریں گی اور آنے والی نسلیں ایسے پولیس آفیسرز کو "Saviors of Humanity" کے نام سے یاد کریں گی۔

''اچھے طالبان'' کو پھر خوش آمدید

رؤف کلاسرا

حملوں، جن میں پچاس عورتیں اور بچے مارے گئے، پر ماتم ہو رہا ہے، پاکستان میں افغان طالبان اور ان کے لیڈر ملا عمر کی شان میں ہمارے کالم نگاروں اور دانشوروں کے درمیان قصیدہ گوئی کا مقابلہ جاری ہے۔

ملا عمر کے حق میں لکھے گئے قصیدوں کے درمیان، دل کو چیرنے والی ایک تصویر نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس دردناک تصویر میں ایک بوڑھا افغان باپ فرش پر اپنی جوان بیٹی کی سفید کفن میں لپٹی لاش کے قریب سر پکڑ کر بیٹھا رو رہا ہے۔ اس بوڑھے افغان کا چند دن کا ایک نواسہ ہے جو اپنی ماں کی نعش کے ساتھ زمین پر پڑا ہے۔ ماں پچھلے ہفتے کابل میں طالبان کے حملوں میں ماری گئی۔ ان حملوں میں کل پچاس افغان شہری مارے گئے، ڈھائی سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والوں میں چالیس افغان عورتیں اور تیس افغان بچے بھی شامل ہیں۔ صرف ایک نیٹو فوجی مرا۔ یہ ہے وہ قیمت جو ایک عام افغان شہری ادا کر رہا ہے اور جو پاکستانی کالم نگاروں اور دانشوروں کو نظر نہیں آتی، جن کے دل پتھر کے ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک ملا عمر کی موت وہ خلا ہے جو پُر نہ ہوگا۔ افغان بچوں اور عورتوں کا کیا ہے، مر بھی گئے تو کچھ اور پیدا ہو جائیں گے۔ ملا عمر تو ایک ہی تھا۔ وہ پریشان نہ ہوں، ملا منصور نے کام وہیں سے شروع کیا ہے جہاں ملا عمر چھوڑ گیا تھا۔ افغانوں نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔ شاید اپنے آباؤ اجداد کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں جنہوں نے ہندوستان پر حملے کر کے ہزاروں بے گناہ مارے تھے۔ اب ان کی باری ہے۔ جو بھی کابل جاتا ہے، وہ لہو کی ندیاں بہانے جاتا ہے۔ روس سے لے کر حکمت یار، احمد شاہ مسعود اور امریکیوں تک، سب نے لاکھوں افغان مارے۔ برسوں سے کابل ایک جہنم کا منظر پیش کرتا ہے۔

میں سمجھا تھا پشاور سکول میں ایک سو چالیس بچوں کی دردناک موت کے بعد ہم نے سبق سیکھا ہوگا کہ ہر قسم کے طالبان بُرے ہوتے ہیں۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ اور لکھاری ہمیں بتاتے رہے کہ جو افغانستان اور بھارت میں دہشت گردی کرتے ہیں وہ اچھے طالبان ہوتے ہیں اور جو پاکستان میں کرتے ہیں وہ بُرے طالبان۔ ہم اسی میں خوش رہے کہ چلیں ہمارے اچھے طالبان نے افغانستان میں بے گناہ لوگوں کو مارنے کا جو سلسلہ شروع کیا، وہ ہمارے لیے بہتر ہے۔ جواباً بھارت اور افغانستان نے بھی پاکستان میں اپنے طالبان پال لیے کہ چلو پاکستانیوں کو مارو۔ پشاور سکول ٹریجڈی کے بعد پاکستانیوں کو طالبان سے نفرت ہونا شروع ہوئی تھی۔ قوم کو پتہ چل گیا تھا کہ اچھے طالبان کوئی نہیں، وہ سب انسانی لہو بہاتے ہیں۔ اس سے طالبان کے حمایتی مایوس ہوئے کہ پاکستانی قوم کو کیسے عقل آ گئی؟ سب کی دکانیں بند ہونے لگی تھیں۔ اب اچانک ملا عمر کی موت نے انہیں ایک موقع دے دیا ہے۔ ملا عمر کی ایسی ایسی صفات بیان کی جا رہی ہیں کہ وہ خود بھی پڑھتا تو حیران ہوتا۔ ان کا خیال ہے کہ پوست ختم کر دینے سے وہ بڑے حکمران بن گئے تھے۔ کابل اور قندھار میں عورتوں پر سرعام تشدد کر کے عالم اسلام کے ہیرو بن گئے تھے۔ اسامہ بن لادن کو اپنے ہاں پناہ دے کر انہوں نے اسلام کی خدمت کی تھی۔ پٹھانوں اور افغانوں کی روایات کی پاسداری کی تھی۔ دس لاکھ افغان مارے گئے۔ افغانوں کے بچے آج پاکستان میں بھیک مانگتے ہیں۔ افغان عورتوں کی دردناک کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ وہ کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ بھیک مانگتے افغان بچے اور عورتیں ہمارے ان لکھاریوں کے نزدیک ملا عمر کی جرأت اور شجاعت کی علامت ہیں۔

اب ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ افغان طالبان تو پاکستان کے دوست تھے۔ میں بعض ایسے کالم نکال کر دکھا سکتا ہوں جن میں انہوں نے افغان طالبان کے پریس ریلیز شائع کیے کہ پاکستانی طالبان، جو پاکستان کے اندر قتل و غارت کر رہے ہیں، ان کو افغان طالبان کی پوری حمایت حاصل

> پشاور سکول ٹریجڈی کے بعد پاکستانیوں کو طالبان سے نفرت ہونا شروع ہوئی تھی۔ قوم کو پتہ چل گیا تھا کہ اچھے طالبان کوئی نہیں، وہ سب انسانی لہو بہاتے ہیں۔ اس سے طالبان کے حمایتی مایوس ہوئے کہ پاکستانی قوم کو کیسے عقل آ گئی؟ سب کی دکانیں بند ہونے لگی تھیں۔ اب اچانک ملا عمر کی موت نے انہیں ایک موقع دے دیا ہے۔ ملا عمر کی ایسی ایسی صفات بیان کی جا رہی ہیں کہ وہ خود بھی پڑھتا تو حیران ہوتا۔ ان کا خیال ہے کہ پوست ختم کر دینے سے وہ بڑے حکمران بن گئے تھے۔ کابل اور قندھار میں عورتوں پر سرعام تشدد کر کے عالم اسلام کے ہیرو بن گئے تھے۔ اسامہ بن لادن کو اپنے ہاں پناہ دے کر انہوں نے اسلام کی خدمت کی تھی۔

ہے۔ یہ کالم اب بھی اخبارات کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ اگر افغان طالبان اچھے تھے اور ملا عمر پاکستان کا دوست تھا تو اس نے اپنے افغان طالبان کے ذمے یہ کام کیوں نہ لگایا کہ پہلے ان پاکستانی طالبان کو ٹھکانے لگاؤ جو افغانستان میں بیٹھ کر پاکستان کے اندر دہشت گردی کر رہے ہیں؟ یہ طالبان نیٹو فورسز کے خلاف افغانستان میں لڑ سکتے ہیں اور کابل میں معصوم بچوں اور عورتوں کو مار سکتے ہیں تو پھر وہ فضل اللہ کو کیوں نہیں مار سکتے تھے؟ غور کریں، کیسے کیسے ہم نے اپنی بربادی کا سامان کیا۔ اپنے قاتلوں سے پیار کیا۔ گلے سے لگایا۔ ان کی شان میں کالم لکھے، ٹی وی شوز کیے۔ طالبان نے ہمارے ایک سو چالیس بچوں کو قتل کیا لیکن آج بھی ہمارے دل میں ان کے لیے محبت ہے، پیار ہے، عزت ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ افغان طالبان کسان تھے اور غریب تھے۔ پھر وہ غریب ہمارے ہاتھ لگ گئے۔ ہم نے انہیں پالا پوسا۔ پاکستانیوں کے ٹیکسوں سے ان کو اربوں روپوں کا بجٹ دیا گیا۔ ہمارے پیسوں سے اسلحہ خرید کر دیا گیا۔ علاج معالجہ کے لیے کوئٹہ اور پشاور میں بندوبست ہوئے۔ کوئٹہ شہر میں پاکستانی سیٹلرز کو مارا گیا اور وہاں افغانوں اور وار لارڈز کو جائیدادیں لے کر دی گئیں۔ ان اچھے طالبان کے خاندانوں کی رہائش، بچوں کی پڑھائی سب کچھ ہمارے ذمے تھا اور ہم نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی۔ ہم نے دنیا کو تاثر دیا کہ اگر طالبان تک پہنچنا ہے تو پھر یہ راستہ ہمارے ذریعے کھلتا ہے۔ طالبان نے غیر ملکی اغوا کیے تو اس ملک نے ہم سے رابطہ کیا اور ہم نے ڈیل کرائی۔ کسی کا جہاز وہاں اغوا کر کے لے جایا گیا تو بھی ہم سے رابطہ ہوا۔ بل کلنٹن پاکستان آیا تو جنرل مشرف سے اس نے درخواست کی کہ اسامہ کو طالبان سے کہہ کر واپس کرائیں۔ جنرل معین الدین حیدر اس کام کے لیے قندھار بھی گئے۔ گیارہ ستمبر کے بعد بش نے جنرل مشرف کو یہی کہا تو جنرل محمود کو اس کام کے لیے بھیجا گیا۔ یوں سب کو پتہ چل گیا کہ طالبان کے اصل گاڈ فادر ہم ہیں۔

پھر جب دنیا نے ہمیں دہشت گردوں کا ساتھی کہنا شروع کیا تو ہم حیران ہونا شروع ہو گئے کہ دیکھو یار یہ کتنی زیادتی کی بات ہے۔ اور پھر ایک دن پتہ چلا ہمارے ایک سو چالیس بچوں کے قاتل افغانستان میں بیٹھے ہیں۔ سب کابل دوڑ پڑے۔ وعدے ہوئے، وعید ہوئے، اچھے برے طالبان کی تمیز مٹانے کے دعوے سنے گئے۔ اور پھر پتہ چلا، ملا عمر دو سال پہلے مر چکے ہیں۔

ملا عمر کبھی جرأت نہ کر سکا کہ وہ اسامہ سے پوچھ سکتا کہ یا حبیبی! آپ ہمارے ہاں دہشت گردی کی تربیت کیوں دے رہے ہیں؟ کیوں عالمی قوتوں کو ہمارا دشمن بنا رہے ہیں؟ آپ کے پاس اتنا پیسہ ہے تو یہاں یونیورسٹیاں کیوں نہیں بناتے؟ ہسپتال کیوں نہیں بناتے؟ افغانستان کو جدید مسلم ریاست بنانے میں کیوں مدد نہیں کرتے؟

خود کوئی ہمارے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ پھینک جائے تو اس کا گریبان پکڑ لیتے ہیں۔ سڑک پر گاڑی کی ٹکر ہو جائے تو فائرنگ شروع کر دیتے ہیں لیکن ہم کیسے یہ توقع کیے بیٹھے تھے کہ امریکہ میں تین ہزار بندے مارے جانے اور اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد بھی اسامہ کے خلاف یورپین کارروائی نہ کرتے؟

جس دن اسامہ نے ویڈیو کے ذریعے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی، ملا عمر کو اسی دن اسے ریاست سے نکال دینا چاہیے تھا۔ امریکہ نے طالبان سے یہی کہا تھا کہ ہماری آپ سے لڑائی نہیں، اسامہ سے ہے جس نے حملوں کی ذمہ داری لی ہے۔ وہ ہمارے حوالے کر دیں، کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ یہ ہمارے دانشور جو آج ملا عمر کی موت پر غم زدہ ہیں، انہوں نے ہی اس وقت لکھا تھا کہ ملا عمر کمزور نہ پڑنا، اسامہ آپ کا مہمان ہے، دس لاکھ افغانی مروا دینا، عورتوں اور بچوں سے پاکستان اور ایران میں بھیک منگوا لینا لیکن جھکنا مت۔ ایسی ایسی افسانوی داستانیں سنائی اور لکھی گئیں کہ افغان طالبان سولی پر چڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ افغانستان میں امن سے ہم سب بیروزگار ہوتے ہیں، ڈالرز ملنے بند ہوتے ہیں، لہٰذا وہاں لہو کا بہتے رہنا ہمارے مفاد میں ہے۔ پشاور سکول سانحہ کے بعد ہم کالم نگاروں اور دانشوروں کی دکان ٹھنڈی پڑی تھی جو ملا عمر کی موت کے بعد نئے سرے سے ہم نے سجا لی ہے۔ میں بھی کیا رام لیلا لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ اب اتنے بڑے مفادات کے کھیل میں بھلا کس کو اس بوڑھے افغان کی فکر ہوگی جو اپنے نواسے کو جوان بیٹی کی لاش کے قریب رکھ کر سڑک کنارے بیٹھا رو رہا ہے۔

خوش آمدید ہمارے اچھے طالبان!

(بشکریہ روزنامہ دنیا)

پاکستانی صنعتوں کے لئے جی ایس پی پلس سکیم کے فوائد

- امریکہ کے بعد یورپی یونین پاکستان کی سب سے بڑی کاروباری شراکت دار ہے۔
- جی ایس پی پلس کے باعث پاکستانی برآمدات کو یورپی یونین کے 28 رکن ممالک میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔
- اب پاکستانی برآمدات کے لئے 500 ملین خریداروں کی مارکیٹ کے دروازے کھل جائیں گے۔
- پاکستان کی سب سے زیادہ برآمد ہونے والی مصنوعات کا تعلق کاٹن اور ٹیکسٹائل کے شعبہ سے ہے۔
- پاکستان کو اپنے مدمقابل (چین، بھارت، ویت نام، تھائی لینڈ، انڈونیشیا) ملکوں پر فوقیت حاصل ہے۔
- اس کی وجہ یہ ہے کہ مدمقابل ملکوں کو ان مارکیٹوں تک رسائی میں استثناء حاصل نہیں ہے اور نہ ہی انہیں کوئی ترجیحی رسائی حاصل ہے۔
- مجموعی ملکی پیداوار میں ٹیکسٹائل کی برآمدات کا 8.5 فیصد حصہ ہے۔ جس کے باعث تقریباً چالیس فیصد ملازمتیں صنعتوں کا شعبہ مہیا کرتا ہے (سٹیٹ بنک آف پاکستان۔ پاکستان اکنامک سروے 2013ء)
- پاکستانی ٹیکسٹائل کی برآمدات دوگنا ہونے کی توقع کی جارہی ہے۔
- جی ایس پی پلس ڈیوٹی فری حیثیت کے ذریعے پراڈکٹ لائن کو وسعت دیتے ہوئے پاکستان مزید اشیاء فروخت کرکے 580 سے 700 ملین ڈالر تک کی اضافی رقم کما سکتا ہے۔
- مشینوں اور ہاتھ سے بنائے گئے ملبوسات کے ذریعے اضافی 280 ملین ڈالر کمائے جاسکتے ہیں۔ اس وقت برآمد کی جانے والی اس 6 فیصد پراڈکٹ کو بڑھا کر 14.5 فیصد تک لے جایا جاسکتا ہے۔
- مزید برآں چمڑے کی مصنوعات سے 97.1 ملین ڈالر اضافی طور پر کمائے جاسکتے ہیں۔
- دوسری مصنوعات کے ذریعے 250 ملین ڈالر کی رقم اضافی طور پر کمائی جاسکتی ہے۔
- جی ایس پی پلس حیثیت ملنے کے بعد بہت بڑی تعداد میں ملازمت کے مواقع ملیں گے۔
- تجارت میں اضافے کے سبب ٹیکسوں کی مد میں حکومت کے خزانے میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔
- ایسی صنعتیں لگانے کے لئے چین اور دوسرے ملکوں کے کاروباری حضرات پاکستان کا رخ کریں گے اور ان صنعتوں میں سرمایہ کاری کریں گے جن کی مصنوعات کی بیرون ملک مانگ ہوگی اور جو جی ایس پی کے ذریعے مصنوعات برآمد کریں گے۔ اس سے یقینی طور پر پاکستانی برآمدات میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔
- مصنوعات سازی پر اٹھنے والی بھاری لاگت کے باعث بین الاقوامی ٹیکسٹائل اور کپڑے کی مارکیٹ میں چین کی شراکت داری داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یورپی یونین میں ڈیوٹی فری رسائی کے باعث پاکستان ٹیکسٹائل اور کلودنگ مارکیٹ کے ایک بڑے حصے پر قابو پاسکتا ہے۔ یہ پاکستان کے لئے ایسا موقع ہوگا جس سے اس کی مالیاتی صورتحال ہمیشہ کے لئے بہتر ہوجائے گی اور اس کا مستقبل سنور جائے گا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ٹیکسٹائل برآمد کنندگان کو زندگی میں اس سے بہتر موقع میسر نہیں آئے گا۔
- ایسی بہت سی مصنوعات جو ٹیکسٹائل کے زمرے میں نہیں آتیں لیکن پاکستان کی روائتی برآمدات یعنی کھیل کا سامان، آلات جراحی، باسمتی چاول یا وہ اشیاء جن کی برآمد میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے مثال کے طور پر تانبا اور جانوروں کے چمڑے پہلے ہی جی ایس پی یا ایم ایف این کی شرح پر یورپی یونین کی ڈیوٹی فری کیٹیگری میں شامل ہوچکی ہیں۔ اس لئے ان مصنوعات کے لئے جی ایس پی شرح کی ترجیحات کا مارکیٹ کی رسائی پر زیادہ اثر نہیں ہوگا۔
- پاکستان تک جی ایس پی پلس ترجیحات کی توسیع سے یقینی طور پر اس کے مقابلے کے رجحان کو تقویت ملے گی تاہم یورپی یونین مارکیٹ تک رسائی میں حتمی کامیابی کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہوگا کہ پاکستان یورپی یونین کے صارفین کی ضروریات کو تعداد اور معیار دونوں حوالوں سے کس حد تک پوری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی جانچا جائے گا کہ پاکستان مصنوعات تیار کرنے کی صلاحیت میں کتنا اضافہ کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی اور ہنرمند افرادی قوت میں اضافے کے لئے کیا اقدامات کرتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ پاکستان اپنے مدمقابل ملکوں کے دفاعی یا جارحانہ اقدامات کا کس انداز سے جواب دیتا ہے۔ صرف جی ایس پی پلس ہی کافی نہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ: ذریعہ: یورپی یونین)

جی ایس پی درجہ بندی کے تحت آنے والی مصنوعات	
درجہ بندی	مصنوعات
مویشی اور گوشت	گھوڑے، کبوتر، خرگوش وغیرہ
ڈیری پراڈکٹس	دہی۔ مکھن وغیرہ
سبزیاں	آلو، پیاز، گوبھی وغیرہ
پھل	کیلا۔ انناس وغیرہ
خشک میوہ جات	کھجوریں، پستہ، بادام، وغیرہ
کھائی جانے والی باقی اشیاء	انڈے، شہد، سرکہ (محفوظ کیا ہوا) وغیرہ
بیج	سبزیاں، بنولہ، سرسوں کے بیج
تیل	پام آئل، سویابین آئل وغیرہ
کیمیکلز	ہائیڈروجن، سلفر، سٹرک ایسڈ وغیرہ
ٹیکسٹائل	کاٹن، سلک (ریشم) وغیرہ
دھاتیں (میٹلز)	نکل، المونیم، زنک وغیرہ
ایکوپمنٹ	مائیکروویو چولہے، ویڈیو ریکارڈرز وغیرہ
وہیکلز	موٹر سائیکل، بائیسکل وغیرہ
ویلیو ایڈڈ مصنوعات	سوتی مصنوعات، آٹا وغیرہ
دوسری اشیاء	سگریٹ، صابن وغیرہ

27 معاہدوں کی تقسیم

انسانی حقوق سے متعلق 7 معاہدے

ماحولیات سے متعلق 8 معاہدے

منشیات پر کنٹرول سے متعلق 3 معاہدے

مزدوروں کے حقوق سے متعلق 8 معاہدے

کرپشن سے متعلق ایک معاہدہ

طے شدہ معاہدے جن پر عملدرآمد سے جی ایس پی پلس کا حقدار بنا جاسکتا ہے

1۔ شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ

2۔ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ
3۔ نسلی امتیاز کی تمام شکلوں کے خاتمہ پر بین الاقوامی معاہدہ
4۔ تشدد اور دوسرے ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلیل ورسوا کرنے والے سلوک یا سزا کے خلاف معاہدہ
5۔ خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کی تمام شکلوں کے خاتمے پر معاہدہ
6۔ بچوں کے حقوق پر معاہدہ
7۔ نسل کشی کے جرم کو روکنے اور اس پر سزا دینے سے متعلق معاہدہ
8۔ ملازمت کرنے کی کم سے کم عمر کا تعین (این 138)
9۔ بچوں سے مشقت لینے کی بدترین شکلوں کے خاتمے کے لئے فوری اقدام کرنے کا معاہدہ۔
10۔ جبری مشقت کے معاہدے کا خاتمہ (این 105)
11۔ جبری لازمی لیبر معاہدے کا خاتمہ (این 29)
12۔ ایک جیسے کام کے لئے مرد اور خاتون کارکنوں کو مساوی اجرت دینے سے متعلق معاہدہ (این 100)
13۔ ملازمت اور ذریعہ معاش کے حوالے سے امتیاز برتنے سے متعلق معاہدہ (این 111)
14۔ ایسوسی ایشن بنانے کی آزادی اور کنونشن منظم کرنے کے حق کے تحفظ کا معاہدہ (این 87)
15۔ اجتماعی سوداکاری سے متعلق اصولوں پر عملدرآمد کرنے کے حوالے سے معاہدہ (این 98)
16۔ نسلی عصبیت کے جرم کے خاتمے اور جرم کرنے کی پاداش میں دی جانے والی سزا سے متعلق بین الاقوامی معاہدہ۔
17۔ اوزون کی تہہ میں تخفیف کا سبب بننے والے جوہر پر مانٹریال پروٹوکول
18۔ خطرناک فضلہ کی ایک ملک سے دوسرے ملک تک منتقلی اور اس کو ٹھکانے لگانے سے متعلق باسل کنونشن۔
19۔ پائیدار متعفن کیمیاوی مادے سے متعلق سٹاک ہام کنونشن۔
20۔ وہ نوع حیات جن کا وجود خطرے میں ہے، ان کی بین الاقوامی تجارت سے متعلق کنونشن۔
21۔ حیاتیاتی تنوع پر کنونشن۔
22۔ بائیوسیفٹی پر بار برداری کے محصول کا معاہدہ۔
23۔ ماحولیاتی تبدیلی پر اقوام متحدہ کے فریم ورک کنونشن کا کیوٹو پروٹوکول۔
24۔ منشیات پر اقوام متحدہ کا سنگل کنونشن (1961ء)
25۔ ذہن یا دماغ پر اثر انداز ہونے والے مادے سے متعلق اقوام متحدہ کا کنونشن (1971ء)
26۔ منشیات اور دماغ پر اثر انداز ہونے والے مادے کی غیر قانونی لین دین کے خلاف اقوام متحدہ کا میکسیکو کنونشن (1988)۔
27۔ کرپشن کے خلاف اقوام متحدہ کا میکسیکو کنونشن

قصور کی روبینہ بی بی کو انصاف کون دے گا؟

روبینہ بی بی کہتی ہے کہ اس کا تیرہ سالہ بیٹا قصور سکینڈل کے ناقابلِ بیان ظلم کا شکار ہوا ہے۔ ڈیڑھ ماہ قبل وہ تھانے میں گئی تھی۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس اہلکار نے اُسے کہا کہ وہ دفان ہو جائے۔ اسے تھانے سے باہر نکال دیا گیا۔ پھر وہ بتاتی ہے کہ اس کے بیٹے کی وڈیو بنائی گئی مگر پولیس والے اسی سے مجرموں جیسا سلوک کر رہے ہیں۔ شکیلہ بی بی کہتی ہے کہ وہ فریاد کرنے پولیس سٹیشن گئی مگر الٹا اسی کے مظلوم بیٹے کو پکڑ لیا گیا۔ اس کا پندرہ سالہ بیٹا ابھی تک جیل میں ہے۔ گاؤں کے امام مسجد کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کچھ لوگ آئے اور کہا کہ زیادتی کیس میں احتجاج کرنے اور انصاف لینے کے لئے پارلیمنٹ ہاؤس اور وزیراعلیٰ کے پاس جانے کا اعلان کرو۔ اس کے بعد پولیس والے جوتوں سمیت مسجد میں گھس آئے، اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے گرایا اور داڑھی سے پکڑ کر پوچھا کہ یہ اعلان کیوں کیا؟ پھر اسے مارتے ہوئے چوکی لے گئے، اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ڈاکوؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس پولیس والے نے اُسے دھمکی دی کہ وہ (یعنی پولیس والا) اُسے (یعنی امام مسجد کو) "مقابلے" میں مار دے گا، اُس پولیس والے کا نام بھی امام نے پریس کو بتایا ہے۔

یہ سب کچھ کسی خفیہ تفتیش کا نتیجہ نہیں، نہ ہی سکاٹ لینڈ یارڈ نے یہ سربستہ "راز" کھولے ہیں۔ سب کچھ میڈیا میں چھپ چکا ہے اور کہا جا چکا ہے۔ متاثرین کا وکیل ٹیلی ویژن چینل پر آیا اور کروڑوں ناظرین کو اس نے بتایا کہ ملزمان کو گزشتہ پندرہ سال سے حلقے میں جیتنے والی سیاسی جماعت کی سرپرستی حاصل ہے۔ وکیل کو ایک عورت نے بتایا کہ وہ پانچ بھائیوں کا جنسی تشدد پچیس برسوں سے برداشت کر رہی ہے۔ اب ان لوگوں کے بچے اس کے بچے کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔ وکیل نے عورت سے پوچھا کہ کیا تم تھانیدار کے پاس گئیں؟ عورت نے جواب دیا کہ وہ گئی تھی۔ اس کی موجودگی میں تھانیدار نے ملزموں کو بلا لیا۔ ایک ملزم نے (اس کا نام بھی عورت نے بتایا) تھانیدار کے سامنے اُسے بالوں سے پکڑا، تھپڑ مارے اور پوچھا کہ پچیس برسوں سے تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تمہارے بچے کے ساتھ ہو گیا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے؟ وکیل نے ٹی وی پر بتایا کہ فحاشی کے خلاف تقریر کرنے والے مولوی کو چوکی کے انچارج نے (اس انچارج کا نام وکیل نے ٹیلی ویژن پر بتایا) مسجد سے نکالا اور تشدد کر کے اس کا بازو توڑ دیا۔ جب مظلوم شکایت کنندگان فریاد کرنے تھانے گئے تو ایس ایچ او نے ان کی وڈیو بنائی اور ملزمان کو بھیج دی۔ جب یہ بے کس اور بے بس لوگ واپس گاؤں پہنچے تو ملزموں نے انہیں مارا۔ ڈی ایس پی نے سماجی کارکن مبین غزنوی پر ڈی پی او کے سامنے تشدد کیا اور اسے کہا کہ فلاں ایم پی اے کو (وکیل نے اس ایم پی اے کا نام ٹیلی ویژن پر بتایا) فون کرو۔ اگر وہ کہیں گے تو تمہیں (یعنی مبین غزنوی کو) چھوڑ دیا جائے گا!

دو ہی امکانات ہیں! یہ سب کچھ... جو پریس میں چھپا ہے اور ٹیلی ویژن پر عوام اور خواص نے سنا ہے... جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ اگر جھوٹ ہے تو پولیس والے اور حکومت وضاحت کیوں نہیں کرتے۔ روبینہ بی بی بھی موجود ہے، شکیلہ بی بی بھی، اس کا بیٹا بھی۔ امام مسجد بھی۔ امام مسجد کو "مقابلے" میں مارنے کی دھمکی دینے والا پولیس مین بھی! جس عورت کو تھانے میں تھپڑ مارے گئے، وہ بھی زندہ ہے، جن پانچ بھائیوں کا وکیل نے ذکر کیا، وہ بھی اسی ملک میں ہیں۔ اگر یہ سب جھوٹ ہے تو پریس والوں پر اور وکیل پر اور الیکٹرانک میڈیا والوں پر مقدمہ کیوں نہیں دائر کیا جاتا؟ انہیں اس جھوٹ پر معافی مانگنے کے لئے کیوں نہیں کہا جاتا؟ آخر وہ ہتک عزت کے مرتکب ہوئے ہیں! اور اگر یہ سب سچ ہے تو حکومت نے کیا ایکشن لیا ہے؟ پولیس والے شکایت کرنے والوں کی وڈیو بناتے ہیں، امام مسجد کو داڑھی سے پکڑ کر اس کا بازو توڑ دیتے ہیں، سماجی کارکن کو مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایم پی اے سے فون کرواؤ..... اور حکومت کچھ بھی نہیں کرتی۔ یہ وہی حکومت ہے جو حکمرانِ اعلیٰ کے پروٹوکول قافلے میں ذرا سی گڑبڑ ہو جانے پر ایس پی سطح کے افسر کو معطل کر دیتی ہے!

اس پولیس کا المیہ یہ ہے کہ سیاست دان اور حکمران طبقات اسے قومی فورس نہیں، خاندانی نوکر سمجھتے ہیں۔ گھروں پر پہرے دلوائے جاتے ہیں۔ گھنٹوں شاہراہوں پر کھڑا رکھا جاتا ہے تاکہ شاہی سواریاں گزریں تو شان و شوکت کا اور تزک و احتشام کا مظاہرہ ہو۔

یہ سب کچھ پولیس کرے تو بدلے میں وہ آزادی مانگتی ہے۔ دنیا میں فری لنچ کہیں نہیں ہوتا، پولیس بھی یہ سب کچھ مفت میں نہیں کرتی۔ غیر اعلانیہ معاہدہ یہ ہے کہ پولیس حکمران خاندانوں کی حفاظت کرے، اپنے آپ کو ان کا ذاتی ملازم سمجھے، اہلِ اقتدار کے اقتدار کی پاسبانی کرے اور بدلے میں اُسے کھلی چھٹی ہے عوام کے ساتھ جو چاہے کرے! چاہے تو ملزموں کو چھوڑ دئے مظلوموں کی ہڈیاں توڑ دئے چاہے تو بے یار و مددگار ملزموں کو تشدد سے ہلاک کر دئے چاہے تو غنڈوں، بدمعاشوں اور بلیک میلروں سے دوستیاں نبھائے۔

(بشکریہ روزنامہ دنیا۔ جناب محمد اظہار الحق کے کالم سے اقتباس)

جنسی تشدد کے واقعات:

مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور جہد حق کے نامہ نگاروں کی جانب سے بھجوائی جانے والی رپورٹوں کے مطابق 11 جولائی سے 19 اگست تک 133 افراد کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جنسی زیادتی کا شکار ہونے والوں میں 77 خواتین شامل ہیں۔ 87 واقعات کے مقدمات درج کیے گئے اور 22 واقعات میں ملوث افراد گرفتار ہوئے۔

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	الیف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن / اخبار
11 جولائی	ث	خاتون	۔	شادی شدہ	ساجد	دیور	موضع لوں والا، رحیم یار خان	درج	۔	روزنامہ جنگ
12 جولائی	ر	خاتون	۔	شادی شدہ	اسلم، ذیشان، علی	۔	سدائے سدھو، شورکوٹ	درج	۔	روزنامہ جنگ
12 جولائی	ب	خاتون	۔	شادی شدہ	یوسف	۔	چک 540 ٹی ڈی اے، مظفر گڑھ	درج	۔	روزنامہ جنگ
13 جولائی	الف	خاتون	۔	شادی شدہ	میاں معروف احمد	اہل علاقہ	مرولہ شریف، اوکاڑہ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
13 جولائی	علی رضا	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	محمد یاسین	اہل علاقہ	جیوکہ، اوکاڑہ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
13 جولائی	ع	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	برکت علی	اہل علاقہ	گاؤں بھیلہ، پاکپتن	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
13 جولائی	ن	خاتون	۔	۔	ارسلان	اہل علاقہ	انور ٹاؤن، پھولنگر	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
13 جولائی	س	خاتون	۔	۔	۔	اہل علاقہ	چونیاں، قصور	درج	۔	روزنامہ خبریں
13 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	40 ج ب، فیصل آباد	درج	۔	ایکسپریس ٹریبون
13 جولائی	۔	بچہ	10 برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	فاروق آباد، فیض آباد	درج	گرفتار	ایکسپریس ٹریبون
13 جولائی	ع	خواجہ سرا	۔	۔	قاسم	اہل علاقہ	راجہ جنگ، قصور	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
14 جولائی	ب	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	حسن محمود	اہل علاقہ	یزمان	درج	۔	شیخ مقبول حسین
14 جولائی	اورنگزیب کمبوہ	مرد	۔	غیر شادی شدہ	شعبان سیال	اہل علاقہ	اللہ آباد کالونی شہداد کوٹ، قمبر۔ سندھ	درج	۔	روزنامہ کاوش
14 جولائی	ث	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عبدالرزاق	بہنوئی	پھولنگر	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
14 جولائی	زاہد	بچہ	8 برس	غیر شادی شدہ	جہانگیر، شاہد	اہل علاقہ	لوہے راجپوتاں، قصور	درج	۔	روزنامہ خبریں
14 جولائی	ح	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	بلال	اہل علاقہ	رچنا ٹاؤن، فیروز والا	درج	گرفتار	روزنامہ نوائے وقت
14 جولائی	ت	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	ریاست	اہل علاقہ	لاہور روڈ، فیروز والا	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
14 جولائی	محمد اسلم	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	عدنان	اہل علاقہ	قصبہ کوہلہ، اوکاڑہ	۔		روزنامہ نوائے وقت
14 جولائی	ش	بچی	۔	غیر شادی شدہ	ذوالفقار	اہل علاقہ	ضیاءنگر، پاکپتن	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
15 جولائی	اجمل	بچہ	13 برس	غیر شادی شدہ	محمد حسین	۔	دربار خانقاہ شریف، بہاولپور	درج	گرفتار	شیخ مقبول حسین
16 جولائی	محمد حسین	بچہ	10 برس	غیر شادی شدہ	ذوالفقار	اہل علاقہ	بادامی باغ، لاہور	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
16 جولائی	پ	خاتون	۔	۔	آصف	اہل علاقہ	محلّہ مظفر آباد، پاکپتن	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
16 جولائی	م	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عقیل	اہل علاقہ	چک 42/4 ایل، اوکاڑہ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
16 جولائی	ج	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	یوسف	اہل علاقہ	رینجر مارکیٹ، منڈی احمد آباد	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
16 جولائی	ر	خاتون	۔	۔	رومان عباس	اہل علاقہ	موضع آڈھا، ڈسکہ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	ایف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن / اخبار
16 جولائی	الف	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	ریاض	اہل علاقہ	چک 343 ج ب، گوجرہ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
16 جولائی	ن	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	سسر	فیصل آباد	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
17 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	ارشد وڑائچ	اہل علاقہ	وہاڑی چوک، ملتان	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
17 جولائی	۔	خاتون	۔	۔	ایوب بلوچ	اہل علاقہ	بہار کالونی، میاں چنوں	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
17 جولائی	شعیب	مرد	14 برس	غیر شادی شدہ	آصف، حسنین	اہل علاقہ	خان بیلہ، رحیم یار خان	درج	گرفتار	روزنامہ خبریں
17 جولائی	گلشن	مرد	15 برس	غیر شادی شدہ	اشرف علی، مقصود کو بھرا ور ساتھی	اہل علاقہ	ڈہرکی، گھوٹکی۔ سندھ	درج	ایک گرفتار	روزنامہ کاوش
18 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	گاؤں متا کے، قصور	درج	۔	روزنامہ خبریں
18 جولائی	۔	خاتون	۔	۔	ارسلان، سلمان	اہل علاقہ	گجرات	درج	۔	روزنامہ جنگ
21 جولائی	الف	خاتون	14 برس	غیر شادی شدہ	خدا بخش	اہل علاقہ	چک 270 ایچ آر، فورٹ عباس	درج	گرفتار	روزنامہ خبریں
21 جولائی	۔	مرد	16 برس	غیر شادی شدہ	وقاص، شمسو	اہل علاقہ	قصور	درج	۔	روزنامہ دنیا
23 جولائی	ع	خاتون	18 برس	غیر شادی شدہ	عباس اور فرید	اہل علاقہ	دستگیر کالونی جیکب آباد۔ سندھ	درج	۔	روزنامہ کاوش
23 جولائی	افغان	بچہ	5 برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	شاہدرہ ٹاؤن، لاہور	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
24 جولائی	س	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عبدالجبار	اہل علاقہ	قصبہ مرادے	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
24 جولائی	۔	بچہ	8 برس	غیر شادی شدہ	ابوبکر	بہنوئی	شیش محل، شیخوپورہ	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
24 جولائی	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	محلّہ رحمان پورہ، شیخوپورہ	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
24 جولائی	ع	بچی	12 برس	غیر شادی شدہ	محمد احمد	اہل علاقہ	165/9 ایل، غازی آباد	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
24 جولائی	حشام	بچہ	10 برس	غیر شادی شدہ	وقار	اہل علاقہ	جڈیالہ کلاں، گوجرانوالہ	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
24 جولائی	خ	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	تجمل	اہل علاقہ	فیروزوالا	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
24 جولائی	ف	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	فیاض	اہل علاقہ	تھانہ بی ڈویژن، فیروزوالا	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
25 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	نوید، سردار، اصغر	اہل علاقہ	289 ای، گکھو منڈی	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
25 جولائی	۔	خاتون	15 برس	غیر شادی شدہ	امجد	اہل علاقہ	گاؤں کاندھوکھاراں، قصور	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
25 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	یاسین	اہل علاقہ	بورے والا	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
25 جولائی	مجتبیٰ	مرد	15 برس	غیر شادی شدہ	عبدالستار	اہل علاقہ	45 ای بی، عارف والا	درج	گرفتار	روزنامہ ایکسپریس
25 جولائی	ر	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	اجمل	اہل علاقہ	تھانہ کنجاہ، گجرات	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
25 جولائی	م	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	اجمل	اہل علاقہ	تھانہ کنجاہ، گجرات	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
26 جولائی	نفیس	مرد	14 برس	غیر شادی شدہ	ندیم، سجاد، بشیر	اہل علاقہ	قصور	درج	۔	روزنامہ خبریں
26 جولائی	ہشام	بچہ	10 برس	غیر شادی شدہ	وقار	اہل علاقہ	گاؤں جڈیالہ، تلے عالی	درج	۔	روزنامہ خبریں

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	ایف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن / اخبار
27 جولائی	ک ش	خاتون	۔	۔	۔	اہل علاقہ	150 شمالی، سرگودھا	۔	۔	روزنامہ نئی بات
27 جولائی	۔	خاتون	18 برس	غیر شادی شدہ	نصر حیات	بہنوئی	عباس پور کالونی، ساہیوال	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
27 جولائی	گ	خاتون	۔	شادی شدہ	انضمام، گلزار، منیر	اہل علاقہ	گاؤں بھوپھڑا، سکھیکی	درج	گرفتار	روزنامہ نوائے وقت
27 جولائی	۔	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	محمد احمد	اہل علاقہ	پاکپتن	۔	۔	روزنامہ ایکسپریس
27 جولائی	م	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	ندیم	اہل علاقہ	پاکپتن	۔	۔	روزنامہ ایکسپریس
28 جولائی	ہارون	بچہ	13 برس	غیر شادی شدہ	آصف، ممتاز	اہل علاقہ	چک 18 ڈبلیو ایم، ساہیوال	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
28 جولائی	کرن	بچی	4 برس	غیر شادی شدہ	ساجد	اہل علاقہ	شجاع آباد	درج	گرفتار	روزنامہ خبریں
28 جولائی	ف	بچی	9 برس	غیر شادی شدہ	امین	اہل علاہ	134/16 ایل، میاں چنوں	۔	۔	خبریں روزنامہ
28 جولائی	ر	خاتون	18 برس	غیر شادی شدہ	اعظم	اہل علاقہ	493 گ ب، ماموں کانجن، فیصل آباد	درج	۔	روزنامہ نئی بات
29 جولائی	۔	خواجہ سرا	۔	۔	ندیم، ظفر، مظہر	اہل علاقہ	دیپالپور	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
29 جولائی	۔	خواجہ سرا	۔	۔	ندیم، ظفر، مظہر	اہل علاقہ	دیپالپور	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
29 جولائی	ش	خاتون	۔	۔	۔	اہل علاقہ	چک 81 ج ب، فیصل آباد	درج	۔	ایکسپریس ٹریبون
29 جولائی	۔	بچہ	6 برس	غیر شادی شدہ	سعد	اہل علاقہ	حسین پور چٹھہ، وار برٹن	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
29 جولائی	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	خاور	اہل علاقہ	قصبہ سوھورام، اوکاڑہ	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
29 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	خالد	سابقہ شوہر	گاؤں 6 ای بی، محمد نگر	۔	۔	روزنامہ ایکسپریس
30 جولائی	رحمان	بچہ	13 برس	غیر شادی شدہ	مجاہد	اہل علاقہ	کومومن، فیروز والا	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
30 جولائی	ب	بچی	4 برس	غیر شادی شدہ	عمران	رشتہ دار	چک 288 گ ب، ٹوبہ ٹیک سنگھ	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
31 جولائی	س	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	ارشد	اہل علاقہ	تلومنڈی، قصور	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
31 جولائی	احمد رضا	بچہ	7 برس	غیر شادی شدہ	نوید	اہل علاقہ	رانا ٹاؤن، فیروز والا	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
31 جولائی	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	علی احمد	اہل علاقہ	رانا ٹاؤن، فیروز والا	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
31 جولائی	ع	بچی	9 برس	غیر شادی شدہ	غلام مرتضی	اہل علاقہ	167 ای بی، پاکپتن	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
یکم اگست	۔	بچہ	11 برس	غیر شادی شدہ	قاری سمیع اللہ	معلم	ننگر، کاہنہ، لاہور	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
2 اگست	م	خاتون	۔	شادی شدہ	آصف، شاہد	اہل علاقہ	کوٹ لکھنانہ، جھنگ	درج	۔	روزنامہ مشرق
3 اگست	ز	خاتون	۔	شادی شدہ	شریف	اہل علاقہ	کوٹ حاکم، پھولنگر، قصور	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
3 اگست	ش	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عمران	اہل علاقہ	بنگلہ گوگیرہ، اوکاڑہ	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
3 اگست	علی اسلم	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	خاور	اہل علاقہ	گاؤں صوبہ رام، دیپالپور	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
3 اگست	س	خاتون	14 برس	غیر شادی شدہ	امجد	اہل علاقہ	56 ایس پی، پاکپتن	درج	گرفتار	روزنامہ نوائے وقت
4 اگست	بلال	بچہ	12 برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	ہڈیارہ، لاہور	درج	۔	روزنامہ نئی بات

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	ایف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن / اخبار
5اگست	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	عمران	اہل علاقہ	گاؤں جامعہ اسلامیہ، قبولہ	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
5اگست	۔	بچہ	8برس	غیر شادی شدہ	اسلم	اہل علاقہ	گاؤں 30/11 ایل، چیچہ وطنی	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
5اگست	۔	بچہ	12برس	غیر شادی شدہ	کامران، عدیل	اہل علاقہ	ننکانہ صاحب	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
5اگست	۔	بچہ	8برس	غیر شادی شدہ	کاشف	اہل علاقہ	مدینہ کالونی، پھولنگر	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
5اگست	۔	خاتون	16برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	فیصل آباد	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
7اگست	الف	بچی	7برس	غیر شادی شدہ	شاہ زیب	اہل علاقہ	محلّہ نظام پورہ، فاروق آباد	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	ک	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	رفاقت	اہل علاقہ	گاؤں دلوکلاں، جلالپور بھٹیاں	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	الف	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	شمعون	اہل علاقہ	قصور	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	پ م	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	نیر	اہل علاقہ	قصبہ پیر عبدالرحمان، جھنگ	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	ش ب	خاتون	۔	۔	ظفر	اہل علاقہ	چک 59 جی ڈی، ساہیوال	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	ت	خاتون	۔	شادی شدہ	ذاکر حسین	اہل علاقہ	چک 59 جی ڈی، ساہیوال	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
8اگست	الف	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	عبدالستان	اہل علاقہ	38 کے بی، پاکپتن	۔	۔	روزنامہ نوائے وقت
9اگست	علی حسین	بچہ	10برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	شاہدرہ ٹاؤن، لاہور	۔	۔	روزنامہ دنیا
9اگست	ع	خاتون	۔	۔	امانت، یوسف	اہل علاقہ	نشتر کالونی، لاہور	درج	۔	روزنامہ دنیا
9اگست	الف	خاتون	۔	۔	افتخاھ	اہل علاقہ	شاہدرموڑ، لاہور	درج	۔	روزنامہ دنیا
10اگست	حسنین	مرد	14برس	غیر شادی شدہ	دانیال	اہل علاقہ	کوٹ زہندی، اٹک	درج	۔	روزنامہ نوائے وقت
10اگست	م	بچی	10برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	پٹھان کالونی، شہر سلطان	درج	۔	روزنامہ ایکسپریس
11اگست	عامر	مرد	15برس	غیر شادی شدہ	عابد، عمران	اہل علاقہ	سمجیہ آباد، ملتان	درج	گرفتار	روزنامہ ایکسپریس
11اگست	۔	بچی	8برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	گاؤں 517 ای بی، بورے والا	درج	گرفتار	روزنامہ ایکسپریس
11اگست	۔	بچی	6برس	غیر شادی شدہ	اکرم	اہل علاقہ	گاؤں گھڑیال کلاں، نارنگ منڈی	درج	گرفتار	روزنامہ نوائے وقت
11اگست	م	خاتون	۔	۔	مجاہد حسین	اہل علاقہ	بستی لاٹاں، حاصل پور	۔	۔	نوائے وقت
11اگست	ارسلان	بچہ	12برس	غیر شادی شدہ	عاطف	اہل علاقہ	ڈیرہ محمدی، ملتان	۔	۔	نئی بات
12اگست	ع	بچی	8برس	غیر شادی شدہ	علی رضا، عبدالغور	اہل علاقہ	یابلک، تاندیانوالہ، فیصل آباد	درج	گرفتار	نئی بات
12اگست	معید	بچہ	10برس	غیر شادی شدہ	نعمان	اہل علاقہ	علی پارک، لاہور	درج	گرفتار	جنگ
12اگست	عبداللہ	بچہ	7برس	غیر شادیشدہ	نعمان	اہل علاقہ	علی پارک، لاہور	درج	گرفتار	جنگ
12اگست	ح	بچہ	10برس	غیر شادی شدہ	تنویر، ارسلان	اہل علاقہ	فیصل آباد	درج	۔	جنگ
12اگست	خلیل	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	شکور	اہل علاقہ	لاہوری چوک، فیصل آباد	۔	۔	جنگ

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	ملزم کا نام	ملزم کا متاثرہ عورت / مرد سے تعلق	مقام	ایف آئی آر درج / نہیں	ملزم گرفتار / نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن/اخبار
12اگست	عثمان	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	اسامہ	اہل علاقہ	شریف پورہ، فیصل آباد	۔	۔	جنگ
12اگست	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	چیچہ وطنی	۔	۔	جنگ
13اگست	م	بچی	3برس	غیر شادی شدہ	محمد اکرم	اہل علاقہ	کسووال، چیچہ وطنی	درج	گرفتار	جنگ
13اگست	ی	خاتون	۔	شادی شدہ	فیاض، ابرار، حامد، سخاوت	اہل علاقہ	قلعہ شبد یونگھ، مانانوالا	۔	۔	نوائے وقت
13اگست	مناہل	بچی	3برس	غیر شادی شدہ	۔	چچا	کسووال	۔	۔	نوائے وقت
13اگست	خالد	مرد	15برس	غیر شادی شدہ	عبداللہ	اہل علاقہ	سیکٹر 4جی، سعید آباد، کراچی	۔	۔	نوائے وقت
15اگست	نزاکت حسین	مرد	17برس	غیر شادی شدہ	۔	اہل علاقہ	چند محلّہ، میر پور ماتھیلو	۔	۔	نوائے وقت
16اگست	الف	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	عبدالغفور	اہل علاقہ	موضع شکر بیلہ، مظفر گڑھ	درج	۔	جنگ
16اگست	الف	بچہ	13برس	غیر شادی شدہ	طارق	اہل علاقہ	158ای بی، بورے والا	درج	۔	جنگ
16اگست	۔	بچی	13برس	غیر شادی شدہ	وسیم	اہل علاقہ	چک 110فتح، چشتیاں	۔	۔	مشرق
18اگست	۔	بچہ	10برس	غیر شادی شدہ	بلا، علی	اہل علاقہ	ایل ڈی اے فلیٹ، فیکٹری ایریا، لاہور	درج	۔	دنیا
18اگست	۔	بچہ	11برس	غیر شادی شدہ	بلا، علی	اہل علاقہ	ایل ڈی اے فلیٹ، فیکٹری ایریا، لاہور	درج	۔	دنیا
18اگست	امیر حمزہ	مرد	14برس	غیر شادی شدہ	عابد	اہل علاقہ	چک 42، سانگلہ	درج	۔	نوائے وقت
18اگست	س	خاتون	16برس	غیر شادی شدہ	ظفر شریف	اہل علاقہ	494 گ ب، ماموں کانجن	۔	۔	نوائے وقت
18اگست	۔	بچہ	12برس	غیر شادی شدہ	طارق لنگڑیال	اہل علاقہ	چک 156، ای بی، بورے والا	۔	۔	نوائے وقت
18اگست	قیصر شہزاد	بچہ	12برس	غیر شادی شدہ	مدثر	اہل علاقہ	بھٹو کالونی، شاہکوٹ	۔	۔	نوائے وقت
18اگست	تصور عباس	بچہ	10برس	غیر شادی شدہ	بنی بخش، اظہر	اہل علاقہ	قصبہ ماچھی والا، مظفر گڑھ	۔	۔	نوائے وقت
19اگست	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	تنویر	اہل علاقہ	چک 5، خانیوال	درج	گرفتار	ایکسپریس
19اگست	۔	خاتون	21برس	غیر شادی شدہ	اللہ یار	اہل علاقہ	بستی ملوک، ملتان	درج	گرفتار	ایکسپریس
19اگست	۔	خاتون	14برس	غیر شادی شدہ	عمران	اہل علاقہ	موضع کوٹ والا، شجاع آباد	درج	۔	ایکسپریس
19اگست	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	ملک قاسم	اہل علاقہ	بستی ملوک، ملتان	۔	۔	ایکسپریس
19اگست	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	نور احمد	اہل علاقہ	گاؤں مرولہ شریف، اوکاڑہ	درج	گرفتار	ایکسپریس
19اگست	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	نور احمد	اہل علاقہ	گاؤں مرولہ شریف، اوکاڑہ	درج	گرفتار	ایکسپریس
19اگست	۔	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	افضل، یعقوب، غلام	اہل علاقہ	دایہ چوکھا، اشرفی سنانواں، کوٹ ادو	۔	۔	ایکسپریس
19اگست	ریحان	مرد	۔	غیر شادی شدہ	محسن	اہل علاقہ	جمیل ٹاؤن، شیخوپورہ	درج	گرفتار	خبریں
19اگست	س ب	خاتون	۔	۔	مشتاق	اہل علاقہ	موضع کھروڑہ باقر، جھنگ	درج	۔	نوائے وقت
19اگست	ک	خاتون	17برس	۔	طارق	اہل علاقہ	کھروڑہ باقر، جھنگ	درج	۔	نوائے وقت

خودکشی کے واقعات

مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور جہدحق کے نامہ نگاروں کی جانب سے بھجوائی گئی رپورٹوں کے مطابق **26** جولائی سے **19** اگست تک کے دوران ملک بھر میں **147** افراد نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کرنے والوں میں **50** خواتین شامل تھیں۔ اعداد وشمار کے مطابق خودکشی کرنے والوں میں **83** افراد نے گھریلو جھگڑوں ومسائل سے تنگ آ کر اور **19** نے معاشی تنگدستی سے مجبور ہوکر خودکشی کر لی۔ خودکشی کے واقعات میں **95** نے زہر کھا/پی کر، **23** نے خود کو گولی مار کر اور **17** نے پھندا لے کر جان دے دی۔ خودکشی کے **127** واقعات میں سے کسی واقعے کی بھی ایف آئی آر درج ہوئی۔

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	وجہ	کیسے	مقام	ایف آئی آر درج/انہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن/اخبار
26 جولائی	عائشہ	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	امتحان میں نمبر کم آنے پر	زہر خورانی	امامیہ کالونی، گوجرہ	۔	روزنامہ دنیا
26 جولائی	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	۔	بھلوال	۔	روزنامہ خبریں
26 جولائی	عبدالرشید	مرد	۔	۔	۔	۔	ٹوبہ ٹیک سنگھ	۔	روزنامہ خبریں
26 جولائی	علی اصغر	مرد	۔	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	خود کو گولی مار کر	گاؤں ولی پور، شاہکوٹ	۔	روزنامہ نئی بات
7 جولائی	عرفان منگنیجو	مرد	18 برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	سگیوں، ہنگورجہ، خیر پور میرس	۔	روزنامہ کاوش
27 جولائی	زینت لغاری	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	رندموری، پھل، نوشہرو فیروز	۔	روزنامہ کاوش
27 جولائی	صائمہ بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	پھندا لے کر	کھڈیاں، قصور	۔	روزنامہ نوائے وقت
27 جولائی	اشرف	مرد	14 برس	غیر شادی شدہ	۔	زہر خورانی	555 گ ب، ماموں کانجن	۔	روزنامہ نوائے وقت
27 جولائی	اقرار	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	شیرا کوٹ، لاہور	۔	روزنامہ نیوز
27 جولائی	نجمہ بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	چک 301 گ ب، ٹوبہ ٹیک سنگھ	۔	روزنامہ نیوز
27 جولائی	شہر بانو	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	گاؤں تیرات، سوات	۔	راولپنڈی نیوز
27 جولائی	بشریٰ بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	پسند کی شادی نہ ہونے پر	زہر خورانی	چک 58 ٹی ڈی اے، بھکر	۔	روزنامہ جنگ
27 جولائی	روبینہ اکبر	خاتون	۔	غیر شادی شدہ	۔	خود کو گولی مار کر	سوڈھی جے والی، وادی سون	۔	روزنامہ جنگ
27 جولائی	کوثر بی بی	خاتون	17 برس	شادی شدہ	۔	پھندا لے کر	چنیوٹ	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	محمد افضل	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	گاؤں چاہ جیدہ، ننکانہ صاحب	۔	روزنامہ مشرق
28 جولائی	محمد انیس	مرد	15 برس	غیر شادی شدہ	امتحان میں ناکامی پر	زہر خورانی	گاؤں جھام والا، جاکے چٹھہ	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	روبینہ	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	پھندا لے کر	چک 140 ج ب، امین پور بنگلہ	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	رضوان	مرد	18 برس	غیر شادی شدہ	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہر خورانی	فیصل پارک، شیخوپورہ	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	عامر شہزاد	مرد	23 برس	۔	۔	زہر خورانی	سرائے عالمگیر	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	عابد علی	مرد	20 برس	۔	۔	زہر خورانی	214 گ ب، مریدوالا، فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
28 جولائی	منیر احمد	مرد	۔	۔	غربت سے دلبرداشتہ ہوکر	زہر خورانی	275 رب، فیصل آباد	۔	روزنامہ دنیا
28 جولائی	غلام فرید	مرد	22 برس	غیر شادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	خود کو گولی مار کر	سکھر	۔	روزنامہ دنیا
28 جولائی	اعجاز علی سومر	مرد	45 برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	خیر محمد آریجا، لاڑکانہ	۔	روزنامہ کاوش
28 جولائی	پہلوان چانڈیو	مرد	16 برس	شادی شدہ	دوسری شادی نہ ہونے پر	خود کو گولی مار کر	زیرو پوائنٹ، قمبر، سندھ	۔	روزنامہ کاوش
29 جولائی	الماش لاکھو	خاتون	30 برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	پھندا ڈال کر	گوٹھ فقیر محمد لاکھو، خیر پور میرس	۔	روزنامہ کاوش
29 جولائی	حوراں کھنڈ	خاتون	40 برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	بھنگو بہن، خیر پور میرس	۔	روزنامہ کاوش
29 جولائی	خالدہ	خاتون	35 برس	شادی شدہ	بیماری سے دلبرداشتہ ہوکر	دریا میں کود کر	تھرمل کالونی، سکھر	۔	روزنامہ کاوش
29 جولائی	عامر بھٹی	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	غوثیہ چوک، فیصل آباد	۔	روزنامہ نیوز
30 جولائی	مزمل	مرد	30 برس	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہر خورانی	کنجاہ، گجرات	۔	روزنامہ نیوز
30 جولائی	محمد صادق	مرد	45 برس	شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	زہر خورانی	چک 279 رب، فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
30 جولائی	فیاض اللہ	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہر خورانی	گولے والی، جوہر آباد	۔	روزنامہ جنگ
30 جولائی	سکینہ بی بی	خاتون	۔	۔	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہر خورانی	156 شمالی، سرگودھا	۔	روزنامہ نئی بات

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	وجہ	کیسے	مقام	ایف آئی آر درج/نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن/اخبار
30جولائی	عدنان	مرد	45برس	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	مہندی محلّہ، گوجرہ	۔	روزنامہ نئی بات
31جولائی	محمد شریف	مرد	65برس	۔	بیماری سے دلبرداشتہ ہوکر	زہرخورانی	باؤوالا، فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
31جولائی	محمد حنیف	مرد	30برس	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	چک401 گ ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
31جولائی	عاصمہ بی بی	خاتون	17برس	غیرشادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	گاؤں بھاگووال، کڑیانوالا	۔	روزنامہ جنگ
31جولائی	محمد خالد	مرد	۔	۔	۔	زہرخورانی	سرائے عالمگیر	۔	روزنامہ جنگ
31جولائی	ماچھی	مرد	45برس	شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	شریف پورہ، کامونکی	۔	روزنامہ جنگ
31جولائی	سفینہ بی بی	خاتون	25برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چک64 ج ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
یکم اگست	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	ستراء، ڈسکہ	۔	روزنامہ نیوز
یکم اگست	الف	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	اگو چک، ڈسکہ	۔	روزنامہ نئی بات
یکم اگست	محمد عمران	خاتون	25برس	۔	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	محلّہ اقبال نگر، بورے والا	۔	روزنامہ نئی بات
یکم اگست	سدرہ	مرد	18برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	مجاہد کالونی، بورے والا	۔	روزنامہ نئی بات
یکم اگست	اکرم	مرد	۔	شادی شدہ	۔	زہرخورانی	محلّہ اسلام پورہ، خانقاہ ڈوگراں	۔	روزنامہ نئی بات
یکم اگست	اسلم	خاتون	25برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چناب نگر	۔	روزنامہ نئی بات
یکم اگست	رومی	خاتون	32برس	غیرشادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	سانده، لاہور	۔	روزنامہ دنیا
یکم اگست	احمد	مرد	28برس	۔	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	کراچی	۔	روزنامہ دنیا
یکم اگست	محمد آصف	مرد	۔	۔	۔	خودکوگولی مارکر	خاران، بلوچستان	۔	روزنامہ دنیا
یکم اگست	حافظ خالد	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	پھالیہ	۔	روزنامہ دنیا
یکم اگست	عابدہ بی بی	خاتون	۔	۔	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	سیالکوٹ	۔	روزنامہ دنیا
یکم اگست	افضل	مرد	25برس	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	عارف والا	۔	روزنامہ جنگ
یکم اگست	رفیع اللہ	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	میانوالی	۔	روزنامہ جنگ
2اگست	محمد افضل	مرد	۔	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ ہوکر	زہرخورانی	چک68ای بی، پاکپتن	۔	روزنامہ دنیا
3اگست	افتخار	مرد	۔	۔	۔	خودکوگولی مارکر	لدھے والا وڑائچ، گوجرانوالہ	۔	روزنامہ نوائے وقت
3اگست	عبدالرزاق	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چک429 گ ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	حمیرا بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چک429 گ ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	عدیل	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	ڈجکوٹ، فیصل آباد	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	کرن بی بی	خاتون	۔	۔	۔	۔	چک378 گ ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	گلناز بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	دریامیں کودکر	وادی نیلم، آزاد کشمیر	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	مریم	خاتون	16برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	محلّہ رحمت آباد، گجرات	۔	روزنامہ نئی بات
3اگست	عنصر عباس	مرد	22برس	غیرشادی شدہ	۔	زہرخورانی	حبیب پورہ، کامونکی	۔	روزنامہ جنگ
3اگست	ذیشان	مرد	22برس	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	موضع باہر والی، گجرات	۔	روزنامہ جنگ
3اگست	محمد حسن	بچہ	11برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	155ای بی، عارف والا	۔	روزنامہ جنگ
4اگست	ملک طاہر محمود	مرد	۔	شادی شدہ	۔	خودکوگولی مارکر	واپڈا ٹاؤن، گوجرانوالہ	۔	روزنامہ جنگ
5اگست	نجمہ	خاتون	16برس	غیرشادی شدہ	۔	پھندالے کر	تاندلیانوالا، فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
5اگست	ذوالفقار	مرد	40برس	شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	دینہ	۔	روزنامہ نوائے وقت
5اگست	سجاد علی مبتلو	مرد	۔	۔	۔	زہرخورانی	خیرپور میرس	۔	روزنامہ کاوش
6اگست	صائمہ	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	کوٹ اللہ دتہ، حجرہ شاہ مقیم	۔	روزنامہ نئی بات
6اگست	اللہ دتہ	مرد	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	15/8 آر، خانیوال	۔	روزنامہ نئی بات
6اگست	روبینہ کوثر	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	تھانہ سٹی، مریدکے	۔	روزنامہ نئی بات

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	وجہ	کیسے	مقام	ایف آئی آر درج/نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن/اخبار
6اگست	انیلہ	خاتون	۔	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	چک 417 گ ب،ٹوبہ ٹیک سنگھ	۔	روزنامہ نیوز
7اگست	اندرلال	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	ہندو محلّہ ٹھل، جیکب آباد	۔	روزنامہ کاوش
7اگست	گلزارعلی منگی	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گوٹھ راہوکھاہی،نوشہرو فیروز	۔	روزنامہ کاوش
7اگست	رابعہ بی بی	خاتون	۔	غیرشادی شدہ	۔	زہرخورانی	بادامی باغ،لاہور	۔	روزنامہ نیشن
7اگست	روبینہ کوثر	خاتون	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	اقبال پارک، فیروز والا	۔	روزنامہ نوائے وقت
7اگست	ثمینہ بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	موسیٰ ڈھٹہ، بھوآنہ	۔	روزنامہ نوائے وقت
7اگست	اصغر	مرد	۔	غیرشادی شدہ	پسند کی شادی نہ ہونے پر	نہر میں کودکر	ظہورحیات کالونی، بھلوال	۔	روزنامہ نوائے وقت
7اگست	گلزاراحمد	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	پھندالے کر	چک 05 گ ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
7اگست	کلثوم بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	۔	زہرخورانی	موضع حاجی والا، نارووال	۔	روزنامہ ایکسپریس
8اگست	غلام اکبرجتوئی	مرد	28برس	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	پیرشیر، لاڑکانہ، سندھ	۔	روزنامہ کاوش
8اگست	آصف	مرد	20برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	کالوال،نوشہرورکاں	۔	روزنامہ جنگ
8اگست	نوراں	خاتون	60برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	نہر میں کودکر	9/135ایل، چیچہ وطنی	۔	روزنامہ نئی بات
8اگست	نعیم عباس	مرد	۔	غیرشادی شدہ	۔	زہرخورانی	ساہیوال	۔	روزنامہ نئی بات
9اگست	نصیباں اوڈ	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گوٹھ ابل ویسر ٹھری میراہ	۔	روزنامہ نئی بات
9اگست	مقصود کلہوڑو	مرد	۔	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	نوشہرو فیروز	۔	روزنامہ کاوش
9اگست	طفیل	مرد	65برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	نواں کوٹ، لاہور	۔	روزنامہ ایکسپریس
9اگست	علی شیر	مرد	16برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	محلّہ گلزار آباد، پاکپتن	۔	روزنامہ ایکسپریس
9اگست	فاطمہ	خاتون	50برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	جناح کالونی، جوہرآباد	۔	روزنامہ جنگ
9اگست	عابدعلی	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
9اگست	اگرہ	مرد	۔	شادی شدہ	غربت سے دلبرداشتہ ہوکر	نہر میں کودکر	چک 1، جڑانوالہ، فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
9اگست	تبسم بی بی	خاتون	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	تھانہ ہوید، بنوں	۔	روزنامہ دنیا
9اگست	گل زمان	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	صوابی	۔	روزنامہ دنیا
10اگست	ایازعباسی	مرد	۔	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	خودکوگولی مارکر	نظرمحلّہ لاڑکانہ، سندھ	۔	روزنامہ کاوش
10اگست	رضیہ	خاتون	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گجرات	۔	روزنامہ دنیا
10اگست	حاکم علی	مرد	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	اوستہ محمد، بلوچستان	۔	روزنامہ دنیا
10اگست	شاہ ولی	مرد	۔	۔	۔	زہرخورانی	سوات	۔	روزنامہ دنیا
10اگست	ردا	خاتون	17برس	غیرشادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	عارف والا، پاکپتن	۔	روزنامہ جنگ
10اگست	علی اصغر	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	عارف واال، پاکپتن	۔	روزنامہ جنگ
10اگست	شریفاں بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	عارف والا، پاکپتن	۔	روزنامہ جنگ
11اگست	راؤاطہر	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	پیرمحل	۔	روزنامہ ایکسپریس
11اگست	عبدالجبار	مرد	50برس	شادی شدہ	۔	نہر میں کودکر	چک 144ج ب، فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
11اگست	منیبوں خان مگسی	مرد	30برس	شادی شدہ	ذہنی معذوری	پھندالے کر	قبوسعیدخان، قمبر، سندھ	۔	روزنامہ کاوش
11اگست	اسداللہ راہو	مرد	18برس	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	گوٹھ نصراللہ، مورو، نوشہرو فیروز	۔	روزنامہ کاوش
11اگست	غلام حسین چانڈیو	مرد	23برس	شادی شدہ	ذہنی معذوری	پھندالے کر	گوٹھ رضا محمد، کاجی کھاوڑ، قمبر	۔	روزنامہ کاوش
11اگست	عمران	مرد	۔	غیرشادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	چک 23 گنجیاں، چشتیاں	۔	روزنامہ نوائے وقت
11اگست	ذوالفقار	مرد	۔	شادی شدہ	۔	زہرخورانی	محلّہ سلطان پورہ، خانقاہ ڈوگراں	۔	روزنامہ جنگ
11اگست	فقیرحسین	مرد	۔	۔	۔	خودکوگولی مارکر	گاؤں ون آر، اوکاڑہ	۔	روزنامہ جنگ

تاریخ	نام	جنس	عمر	ازدواجی حیثیت	وجہ	کیسے	مقام	ایف آئی آر درج/نہیں	اطلاع دینے والے HRCP کارکن/اخبار
11اگست	ذبیر	مرد	۔	غیر شادی شدہ	ذہنی معذوری	خودکوگولی مارکر	چک38ج ب،فیصل آباد	۔	روزنامہ جنگ
11اگست	خالدہ	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	246رب،فیصل آباد	۔	روزنامہ خبریں
12اگست	بختاور	مرد	45برس	شادی شدہ	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	دلے والا	۔	روزنامہ نوائے وقت
12اگست	عرفان	مرد	25برس	غیر شادی شدہ	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	شاہ کوٹ سٹی،فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
12اگست	۔	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	ملکہ ہانس	۔	روزنامہ نوائے وقت
13اگست	۔	مرد	۔	۔	۔	دریامیں کودکر	گڈو بیراج،کشمور،سندھ	۔	روزنامہ کاوش
13اگست	نسیم بی بی	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گاؤں اولکھ،قصور	۔	روزنامہ جنگ
13اگست	۔	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	عیدگاہ کالونی،لالیاں چنیوٹ	۔	روزنامہ جنگ
13اگست	امیر	مرد	60برس	۔	۔	پھندالے کر	دھیر پکڑانوالا،منکیرہ	۔	روزنامہ جنگ
13اگست	محمد فیاض	مرد	۔	غیر شادی شدہ	۔	خودکوگولی مارکر	جھمٹ،سرگودھا	۔	روزنامہ دنیا
13اگست	فقیرحسین	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	دیپالپور	۔	روزنامہ دنیا
13اگست	ریاض	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	چک9/1آر،دیپالپور	۔	روزنامہ دنیا
13اگست	مرزا کامران	مرد	32برس	غیر شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	چائنہ سکیم،گجر پورہ،لاہور	۔	روزنامہ نوائے وقت
13اگست	۔	خاتون	16برس	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	ہیڈ حاجی پور،بہاولپور	۔	ایکسپریس ٹریبون
14اگست	نادرمزاری	مرد	۔	۔	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گوٹھ ہاشم شکلانی،ڈہرکی،گھوٹکی	۔	روزنامہ کاوش
15اگست	محمد شعبان بھٹو	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	مصطفیٰ آباد کالونی ڈہرکی،گھوٹکی	۔	روزنامہ کاوش
16اگست	نارو	مرد	16برس	۔	گھریلو جھگڑا	پھندالے کر	ڈہرکی،گھوٹکی	۔	روزنامہ کاوش
14اگست	ز	خاتون	18برس	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	گوجرہ	۔	روزنامہ دنیا
14اگست	نذیراحمد	مرد	24برس	غیر شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	رحیم یارخان	۔	روزنامہ دنیا
15اگست	صفدر	مرد	۔	شادی شدہ	معاشی حالات سے دلبرداشتہ	پھندالے کر	کوٹ حلیم خان،قصور	۔	روزنامہ دنیا
15اگست	سمیرا	خاتون	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	فتح شیر کالونی،ساہیوال	۔	روزنامہ دنیا
15اگست	علی حیدر	مرد	16برس	غیر شادی شدہ	۔	زہرخورانی	فتح شیر کالونی،ساہیوال	۔	روزنامہ دنیا
15اگست	شکیب اللہ	مرد	۔	۔	۔	پھندالے کر	بھٹنی آباد،ڈیرہ اسماعیل خان	۔	روزنامہ دنیا
15اگست	س	خاتون	۔	۔	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	فیروزوالا	۔	روزنامہ نوائے وقت
15اگست	لیاقت علی	مرد	40برس	۔	بیروزگاری سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	جڑانوالا،فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
15اگست	سلیم انصاری	مرد	۔	۔	۔	زہرخورانی	محلّہ لاہن پار،گکھڑ منڈی	۔	روزنامہ جنگ
15اگست	احسان	مرد	16برس	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	بٹالہ کالونی،فیصل آباد	۔	روزنامہ نئی بات
15اگست	اکرم	مرد	15برس	غیر شادی شدہ	انصاف نہ ملنے پر	ٹرین تلے آکر	جیٹھہ بھٹہ،رحیم یارخان	۔	روزنامہ نئی بات
15اگست	فواد	بچہ	۔	غیر شادی شدہ	۔	خودکوگولی مارکر	ڈگر،بنیر	۔	راولپنڈی نیوز
16اگست	عبدالرشید انصاری	مرد	22برس	شادی شدہ	بیماری سے دلبرداشتہ ہوکر	نہر میں کودکر	باڈہ،لاڑکانہ،سندھ	۔	روزنامہ کاوش
16اگست	سعداللہ جمرانی	مرد	30برس	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	خودکوگولی مارکر	نزد تنگوانی،کشمور	۔	روزنامہ کاوش
19اگست	ملک عمران	مرد	۔	شادہ شدہ	۔	خودکوگولی مارکر	چک باوے والا،فیصل آباد	۔	روزنامہ نیوز
19اگست	وقاص احمد	مرد	۔	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چک739،گ ب کمالیہ	۔	روزنامہ نیوز
19اگست	نبیل	مرد	24برس	غیر شادی شدہ	محبت میں ناکامی	زہرخورانی	محلّہ وارث پورہ،فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
19اگست	اشفاق	مرد	20برس	غیر شادی شدہ	پسند کی شادی نہ ہونے پر	زہرخورانی	چک نمبر192،رب،فیصل آباد	۔	روزنامہ نوائے وقت
19اگست	ک	مرد	۔	۔	گھریلو حالات سے دلبرداشتہ	زہرخورانی	ڈسکہ	۔	روزنامہ نوائے وقت
19اگست	ارشاد	مرد	۔	شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	چک نمبر25،جنوبی،بھاگٹانوالہ	۔	روزنامہ نوائے وقت
19اگست	جمیل احمد	مرد	۔	غیر شادی شدہ	گھریلو جھگڑا	زہرخورانی	وارڈ نمبر2،قصور	۔	روزنامہ نوائے وقت

مرمر کی رگوں میں زیتون کی جڑیں

منو بھائی

عملی زندگی میں قدم رکھنے کی تیاریوں میں مصروف نسلوں کے لئے پاکستان کے کمیشن برائے انسانی حقوق نے ایک بہت مفید، لازمی اور قابل قدر کتاب ''آنے والی نسلوں کے لئے انتہا پسندی سے پاک پرامن معاشرے کا قیام'' شائع کی ہے۔ اس کتاب میں عہد حاضر کے تقریباً تمام انسان دوست، انسانیت نواز قلم کاروں اور دانشوروں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں جو اس کتاب کو اکتساب علوم زندگی کی کورس کی کتاب بنا دیتے ہیں۔

لکھنے والوں میں آئی اے رحمان، ڈاکٹر مہدی حسن، ڈاکٹر حسن عسکری، بابر ستار، حفیظ بزدار، ندیم عباس، امجد علی شاکر، اجمل کمال، پرویز ہود بھائی، خالد احمد، مہتاب راشدی، موسیٰ کلیم، پروفیسر احمد، خالد رحمان، محمد حنیف اور کامران عارف شامل ہیں جن کے فکر افروز مضامین انسانی حقوق دہشت گردی اور انتہا پسندی کے رجحانات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ انسانی آبادی اور معاشرے کے عصری تقاضے بھی بیان کرتے ہیں۔

پاکستان میں انسانی حقوق کا ارتقاء، عصری تقاضے اور اقوام متحدہ کا کردار، جمہوریت اور انسانی حقوق اور ترقی، پاکستان میں آمریت کے مختلف ادوار ایک سرسری جائزہ، جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی کی دہشت ناک صورتحال، قانون سازی اور آئین میں ترمیم کا طریقہ کار انتہا پسندی، اس کے پھیلاؤ اور انسداد میں ریاست کا کردار، ریاست کا معذرت خواہانہ رویہ انتہا پسندوں کی قوت کا موجب، مذہب کی من مانی تشریح، انتہا پسندی کے لئے آلہ کار، ایک تاریخی جائزہ اس کتاب کے چند فکر افروز ابواب کے عنوان ہیں جن میں بہت سہل اور عام فہم زبان اور انداز میں نوآموز ذہنوں تک دہشت گردی، انتہا پسندی اور تشدد پسندی کے رجحانات کے مقابلے میں علم و دانش اور برداشت کی طاقتوں کو استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

اشفاق احمد مرحوم کے محبوب ملک رومتہ الکبریٰ کے عظیم شاعر یانس رٹسا س اپنی ایک طویل نظم میں بتاتے ہیں کہ مرمر کے پہاڑوں پر صرف زیتون کے پودے اگتے ہیں۔ میں نے اس نظم کا ترجمہ کرنے کے دوران فیض احمد فیض سے پوچھا کہ مرمر کے پہاڑوں پر صرف زیتون کے پودے ہی کیوں اگتے ہیں؟ فیض صاحب نے بتایا کہ مرمر چونے کا پتھر ہے اور چونا نباتات کا دشمن ہوتا ہے چونے میں پودوں اور درختوں کی جڑیں نہیں اتر سکتیں مگر مرمر ایک سانس لینے والا پتھر بھی ہے جس کی سانس لینے والی رگوں میں صرف زیتون کی جڑیں ہی اتر سکتیں ہیں۔ یہ جڑیں بہت نازک ہوتی ہیں اور غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے زیتون کی رگوں میں اتر اجاتی ہیں۔ جیسے بلھے شاہ، حسن حسین اور سلطان باہو کے شعر سے بھی زیادہ سخت ذہنوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

فیض صاحب نے بتایا کہ مرمر چونے کا پتھر ہے اور چونا نباتات کا دشمن ہوتا ہے چونے میں پودوں اور درختوں کی جڑیں نہیں اتر سکتیں مگر مرمر ایک سانس لینے والا پتھر بھی ہے جس کی سانس لینے والی رگوں میں صرف زیتون کی جڑیں ہی اتر سکتیں ہیں۔ یہ جڑیں بہت نازک ہوتی ہیں اور غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے زیتون کی رگوں میں اتر اجاتی ہیں۔ جیسے بلھے شاہ، حسن حسین اور سلطان باہو کے شعر سے بھی زیادہ سخت ذہنوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے کمیشن برائے انسانی حقوق کی جانب سے شائع ہونے والی اس کتاب کے مضامین کے لکھنے والوں نے بھی زیتون کی جڑوں کا نازک اور نرم انداز اختیار کیا ہے تاکہ مرمر کی رگوں میں ان کی نرم و نازک شاخیں اتر سکیں۔ عام لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے کا بہترین طریقہ بھی یہی ہے کہ نرم و نازک زیتون کی جڑوں کی طرح مرمر کی رگوں میں اترنے کی کوشش کی جائے۔ لوگوں پر اپنے خیالات نظریات مسلط کرنے کی بجائے لوگوں کے ذہنوں خیالوں اور سوچوں کے اندر اترنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوشش مشکل ضرور ہے مگر پائیدار اور محفوظ بھی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ)

چار تشدد زدہ لاشیں برآمد

کوئٹہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں بم دھماکے اور تشدد کے دیگر واقعات میں ایک پولیس اہلکار سمیت پانچ افراد ہلاک ہو گئے جبکہ بلوچستان کے مختلف علاقوں سے چار افراد کی تشدد زدہ نعشیں برآمد ہوئیں۔ گوالمنڈی پولیس کے ایک اہلکار نے بتایا کہ 12 اگست کو نامعلوم افراد نے گوالمنڈی چوک پر دو دکانوں کے درمیان خالی جگہ میں دھماکہ خیز مواد رکھا تھا۔ لوگوں نے مشکوک سمجھتے ہوئے پولیس کو اطلاع دی۔ انھوں نے بتایا کہ جب ایک پولیس اہلکار نے مشکوک دھماکہ خیز مواد کو اٹھانے کی کوشش کی تو یہ زوردار دھماکے سے پھٹ گیا جس کے نتیجے میں پولیس کا ایک اہلکار ہلاک اور چھ افراد زخمی ہو گئے۔ برآمد ہونے والی چار تشدد زدہ لاشوں میں سے تین کوئٹہ سے متصل ضلع پشین کے علاقے سرانان سے برآمد کی گئیں۔ پشین انتظامیہ کے ایک اہلکار نے بتایا کہ تینوں افراد کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی لاشیں سرانان کے علاقے میں پھینک دی گئی تھیں۔ اہلکار کے مطابق ان افراد کے گلے پر رسی کے نشانات کے علاوہ انھیں گولیاں بھی ماری گئی تھیں۔ تینوں افراد کی عمریں 30 سے 40 سال کے درمیان ہیں۔ اہلکار نے بتایا کہ ہلاک کیے جانے والے افراد شکل و شباہت سے افغانی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اور تشدد زدہ لاش ایران سے متصل ضلع کیچ کے علاقے ڈانڈار سے برآمد کی گئی۔ ڈانڈار سے ملنے والی لاش 20 سالہ نوجوان کی تھی۔ ان چاروں افراد کی ہلاکت کے محرکات معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ بلوچستان میں حالات کی خرابی بالخصوص 2007 سے تشدد زدہ لاشوں کے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ سرکاری خبر رساں ادارے اے پی پی کے مطابق گذشتہ دنوں سینٹ کی انسانی حقوق سے متعلق قائمہ کمیٹی کو صوبائی محکمہ داخلہ کی جانب سے دی جانے والی بریفنگ میں بتایا گیا تھا کہ 2010 سے جون 2015 تک برآمد ہونے والی لاشوں کی تعداد 853 تھی۔

(نامہ نگار)

لاپتہ کارکن کی آٹھ ماہ بعد گھر واپسی

جامشورو جبری طور پر گمشدہ ہونے والے کارکن کملیش کمار جو تقریباً آٹھ ماہ قبل لاپتہ ہو گئے تھے، 4 اگست کی شام گھر واپس لوٹ آئے۔ رہائی کے بعد کملیش کمار نے بتایا کہ دوران حراست پہلے ماہ کے دوران انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جو کی وجہ سے ان کے منہ سے خون بہنے لگا اور انہیں نامعلوم مقام پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ انہیں نامعلوم افراد نے 26 نومبر 2014ء کو جامشورو ہاؤسنگ سوسائٹی سے اغواء کیا تھا۔ ان کے بھائی سنیل کمار سنگی نے ایچ آر سی پی کے ٹاسک فورس آفس میں 29 جولائی 2015ء کو ''سندھ میں گمشدگیاں'' پر منعقد ہونے والے اجلاس میں بتایا کہ، ''26 نومبر کو کملیش نوٹس خریدنے کے لیے فوٹو کاپی کی ایک دکان پر کھڑا تھا کیونکہ اس دن اس کا امتحان تھا۔ اس دوران ایس پی 0707 نمبر پلیٹ والی ایک کرولا وہاں آ کر رکی۔ کار ہی میں سے سادہ کپڑوں میں ملبوس دو نامعلوم افراد باہر آئے اور کملیش کو اغواء کر لیا۔

(نامہ نگار)

انتہا پسندی سے پاک معاشرے کا قیام

مقتدا منصور

جس روز یہ اظہاریہ شایع ہونا ہے، اس کے گزشتہ روز قوم 69واں یوم آزادی یا آزادی کی 68ویں سالگرہ منائے گی۔ اس دوران پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گذر چکا ہے۔ چوتھی نسل پیدا ہوجانے کے باوجود ہم نہ تو اپنا قومی تشخص ترتیب دے سکے ہیں اور نہ ہی ریاست کے منطقی جواز کو کوئی واضح سمت دے سکے ہیں، جب کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کے مقابلے میں ملک کئی بھیانک سانحات اور شکست وریخت کے بدترین عمل سے ضرور گزرا ہے۔ لہٰذا ایک اظہاریہ 66برس کے دوران رونماء ہونے والے واقعات کا احاطہ خواہ انتہائی اختصار کے ساتھ ہی کیوں نہ کیا جائے، مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ابھی اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ اس اظہاریہ کا موضوع کیا ہو کہ انسانی حقوق کمیشن پاکستان (HRCP) کی جانب سے ایک کتاب ملی، جس کے ساتھ حسین نقی کا رقعہ بھی منسلک تھا جس میں اس کتاب پر اظہار رائے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی، حسین نقی کا کہا حکم کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ وہ میرے لیے فکری اتالیق کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اس طلبہ تنظیم NSF کے مرکزی رہنما رہے ہیں، جس کا میں بھی کبھی ایک ادنیٰ کارکن رہا ہوں۔ ان کے علاوہ آئی اے رحمان اور عاصمہ جہانگیر کے ساتھ فکری ونظریاتی قربت اور HRCP کی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد، اس تنظیم کے ساتھ میری وابستگی کا سبب ہے۔

نئی نسل کے بہتر مستقبل اور ان کے خوشگوار حال کے بارے میں سوچنا تو دور کی بات، ہم اور ہمارے بزرگوں نے اپنی نسل کی بہتری کے بارے میں بھی کبھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا۔ وگرنہ آج ہم نہ تو اس فکری ابتری کا شکار ہوتے اور نہ ہی یہ ملک اس طرح توکل من اللہ چل رہا ہوتا۔ البتہ کچھ دردمند لوگ مستقبل کی فکر میں ضرور ہلکان ہوتے ہیں، مگر نقارخانے میں طوطی کی آواز کی مانند انھیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ طے ہے کہ اگر ہمارے حکمران ذہنی اور فکری طور پر مستعد ہوتے اور انھیں نئی نسلوں کا مستقبل عزیز ہوتا، تو قصوروالا واقعہ رونما نہ ہوتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی سانحہ ہوجاتا ہے، تو کچھ عرصے کے لیے شور وغوغا ہوتا ہے، پھر وہی سکوت۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی سطح پر بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی کوئی دیرپا اور پائیدار منصوبہ بندی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ریاستی مقتدرہ اپنے اطراف میں ہونے والے سنگین جرائم سے بے خبر مسلسل اقتدار کے کھیل میں مصروف رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی گروہ معصوم بچوں کو ورغلا کر انھیں خودکش حملہ آور بنا دیتا ہے۔ کبھی بچوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی اور بلیک میلنگ کے واقعات سامنے آتے ہیں، جب کہ چائلڈ لیبر ایک ناسور کی شکل اختیار کرچکا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ حالانکہ پاکستان نے چائلڈ لیبر کے کنونشن (182) پر دستخط کرتے ہوئے ان کی توثیق کی ہے۔ اسی طرح 1973ء میں منظور ہونے والے کم سے کم عمر کے کنونشن پر بھی کوئی عمل نہیں ہورہا۔ حالانکہ پاکستان تحریری طور پر یہ واضح کرچکا ہے کہ پاکستان میں چائلڈ ایج کی آخری حد 14برس ہوگی۔ مگر 8-10برس عمر کے بیشمار بچے مختلف نوعیت کی بدترین چائلڈ لیبر میں مصروف ہیں۔

بے حسی کے اس ماحول میں انسانی حقوق کمیشن (HRCP) نے ''آنے والی نسلوں کے لیے انتہا پسندی سے پاک پرامن معاشرے کا قیام'' نامی کتاب شایع کرکے اہل وطن کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں کل 9 ابواب ہیں۔ ہر باب میں 5 سے 6 مضامین شامل ہیں۔ پہلے باب میں انسانی حقوق کی تحریک کے پس منظر اور ارتقاء کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں انسانی حقوق کے جمہوریت اور معاشی ترقی کے ساتھ تعلق پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں انتہا پسندی کے پھیلاؤ اور انسداد میں ریاستی کردار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چوتھا باب مزید اہم ہے، کیونکہ اس میں انتہا پسندی کے فروغ میں میڈیا کے کردار کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ پانچویں باب میں تعلیم کے مقاصد جب کہ چھٹے باب میں انتہا پسندی، عوامل اور اثرات کا کھل کر احاطہ کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں بین المذاہب ہم آہنگی اور عدم برداشت کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں مختلف مذاہب میں انسانی حقوق کے تصور اور نویں باب میں انسانی حقوق کے نفاذ اور فروغ میں سول سوسائٹی کردار پر بحث کی گئی ہے۔

> نئی نسل کے بہتر مستقبل اور ان کے خوشگوار حال کے بارے میں سوچنا تو دور کی بات، ہم اور ہمارے بزرگوں نے اپنی نسل کی بہتری کے بارے میں بھی کبھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا۔ وگرنہ آج ہم نہ تو اس فکری ابتری کا شکار ہوتے اور نہ ہی یہ ملک اس طرح توکل من اللہ چل رہا ہوتا۔

دیگر موضوعات سے صرف نظر کرتے ہوئے، ہم اپنی توجہ صرف چوتھے باب تک محدود رکھنا چاہیں گے کیونکہ اس باب میں انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کے کردار پر بات کی گئی ہے۔ اس باب میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون جنوبی ایشیا میں میڈیا اور صحافت کے لیے صنفی مساوات سے متعلق منشور ہے۔ دوسرا حفیظ بزدار کا مضمون ''فکر کے زاویے'' ہے۔ تیسرا مضمون انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ ہے جو امجد علی کا تحریر کردہ ہے۔ چوتھا مضمون، پنجاب شفافیت اور معلومات تک رسائی (ٹی آر ٹی آئی) کا ایکٹ 2013ء۔ پانچواں مضمون آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کا ضابطہ اخلاق۔ لیکن حفیظ بزدار کے مضمون ''فکر کے زاویے'' میں اٹھائے گئے سوالات میں سے چند کو نقل کرنا چاہیں گے جو ذرائع ابلاغ کے حوالے سے بعض اہم اور فکرانگیز معاملات کا احاطہ کرتے ہیں۔ مثلاً کیا ہمارا میڈیا اپنے فرائض ذمے داری سے ادا کررہا ہے؟ کیا لال مسجد اور عدلیہ بحالی تحریک کی رپورٹنگ میں بازی لے جانے کی خاطر صحافت کے بہت سے اصول اور اخلاقیات نظرانداز نہیں ہوئے؟ کیا کسی رپورٹر یا تبصرہ نگار کو کسی بھی سانحہ کو اپنی خواہش اور سوچ کا رنگ دے کر پیش کرنے کا حق ہے؟ کیا میڈیا نے بعض بیانات کو سیاق وسباق سے جدا کرکے جنونیوں کو اکسانے کا کام نہیں کیا؟ یہ اور ان جیسے دیگر کئی سوالات ایسے ہیں، جو ملک کے قلمکار اور متوشش شہری اکثر وبیشتر اٹھاتے رہے ہیں مگر ان پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ سابق گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے بعد ہم نے اپنے اظہاریے میں اسی نوعیت کے کئی سوالات اٹھائے تھے اور ساتھی صحافی دوستوں سے استدعا کی تھی کہ وہ کسی بھی واقعے یا سانحے کو اپنی خواہشات اور تصورات کا رنگ دینے سے گریز کریں۔ کیونکہ اس طرح مختلف نوعیت کی عصبیتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ خاص طور پر ذرا سی غیر ذمے دارانہ رپورٹنگ کمیونل یا لسانی عصبیتوں کو متشدد شکل دینے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہاں 2002 میں بھارتی ریاست گجرات میں ہونے والے کمیونل فسادات میں رپورٹر کی لغزش کا تذکرہ ضروری ہے۔ ان فسادات میں کم وبیش 20 ہزار کے قریب لوگ جاں بحق ہوئے۔ اربوں روپے کی املاک خاکستر ہوئی۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ گھائل ہوئے۔

واقعے کا سبب گجراتی چینل کے رپورٹر کی ایک رپورٹ بنی، جس میں مذکورہ رپورٹر نے گودھرا اسٹیشن پر کھڑی ٹرین کی دو بوگیوں میں لگنے والی آگ کی ابتدائی رپورٹ دیتے ہوئے بعض ایسے اضافی جملے کہے جو فسادات کا باعث بنے۔ جملے یہ تھے، ''گودھرا اسٹیشن پر کھڑی ٹرین کی دو بوگیوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ ٹرین میں متھرا سے یاتری آرہے تھے۔ اسٹیشن کے قریب ہی مسلمانوں کی بستی ہے۔'' رپورٹ کے آخری جملے یعنی ''ٹرین میں متھرا سے یاتری آرہے تھے اور اسٹیشن کے قریب ہی مسلمانوں کی بستی ہے'' وہ اضافی جملے تھے جو پوری گجرات ریاست کو فسادات کی آگ میں دھکیلنے کا باعث بنے۔

قصور میں بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی داستان آج منظر عام پر آئی ہے مگر وطن عزیز میں بچے اس سے زیادہ خوفناک زیادتیوں کا ہر روز شکار ہوتے رہتے ہیں۔ حکمرانوں کی عدم توجہی اور والدین کی بے شعوری کے سبب ملک کا ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر قریہ معصوم بچوں کے لیے جہنم بنا ہوا ہے۔ کہیں وہ اسکولوں کا رخ کرنے کے بجائے کم عمری میں محنت مشقت کرنے پر مجبور ہیں۔ کہیں ان کے ساتھ جنسی زیادتی ہوتی ہے اور بقیہ عمر نفسیاتی مریض کے طور گذارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کہیں انھیں جنت میں جانے کا جھانسا دے کر خودکش حملہ آور بنایا جارہا ہے مگر آنے والے کل اس ملک کی ذمے داریاں سنبھالنے والی نسل کو ایک صحت مند تعلیم یافتہ زندگی مہیا کرنے اور ان کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی کسی بھی جانب سے کوئی عملی کوشش نہیں ہورہی ہے۔ حکمران نئی نسل کے مستقبل کو محفوظ اور بہتر بنانے کے لیے کسی قسم کی ٹھوس، پائیدار اور دیرپا حکمت عملی بنانے میں 68 برس گذر جانے کے باوجود ناکام ہیں۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ ہر روز اٹھنے والے نت نئے سوالات کے جوابات تلاش کرنے اور ملک کو درپیش مختلف نوعیت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے حکمرانوں، منصوبہ سازوں اور سیاسی جماعتوں کو اپنا طرز عمل تبدیل کرنا ہوگا۔ انھیں سرد جنگ کی نفسیات سے باہر نکل کر آج کی دنیا کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے مستعدی، فعالیت اور Pro active رویوں کو اپنانا ضروری ہوگیا ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

ایچ آر سی پی: ایک شاندار کتاب

زاہدہ حنا

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان سے میرا بہت پرانا دلی تعلق ہے۔ان کے مختلف سیمیناروں میں شرکت کرنا ہمیشہ میں نے اپنی ذمے داری سمجھی ہے۔عاصمہ جہانگیر، حسین نقی، آئی اے رحمان، حنا جیلانی اور اس سے جڑے ہوئے دوسرے لوگوں کے کام کو سراہا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ چند دن پہلے جب مجھے کمیشن کی ایک کتاب 'آنے والی نسلوں کے لیے انتہا پسندی سے پاک پُرامن معاشرے کا قیام' موصول ہوئی تو جی خوش ہوگیا کیونکہ اس کے ساتھ جناب حسین نقی کا ایک خط بھی منسلک تھا جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ میں اس رپورٹ کے بارے میں کچھ لکھوں۔

انتہا پسندی ہمارے سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور اس کی خوفناکیوں کے بارے میں قلم اٹھانا ایک لکھنے والے کے طور پر میں ذاتی ذمے داری سمجھتی ہوں اور جب اس کی فرمائش حسین نقی کریں تو اس ذمے داری میں دلی راحت بھی شامل ہوجاتی ہے۔

جناب حسین نقی میرے لیے ایک ایسے ہیرو ہیں، جن سے میری ملاقات سالہا سال بعد ہوئی لیکن ایک باضمیر فرد کے طور پر انہوں نے سماج کو سنوارنے کی جو لڑائی قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں سے لڑی، اس نے لوگوں کی نظر میں ان کا قد وقامت بہت بلند کردیا۔آج وہ لگ بھگ 80 برس کے ہوچکے، اپنی طالب علمی کے زمانے میں وہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہوئے اور طلبہ کے حقوق کے لیے لڑتے رہے۔

ان کی ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ آج ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے کہ جب کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے 3 بلوچ طلبہ کو 3 برس کے لیے یونیورسٹی سے خارج کردیا تو حسین نقی اس وقت کراچی یونیورسٹی کی طلبہ تنظیم کے صدر تھے۔

انہوں نے وائس چانسلر کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ ان طالبعلموں کو معاف کردیں لیکن جب وی سی اس بات کے لیے راضی نہ ہوئے تو آخرکار یہ مسئلہ اس طرح طے ہوا کہ ان 3 بلوچ طلبہ کی سزا منسوخ کردی گئی اور ان کی جگہ حسین نقی 3 سال کے لیے یونیورسٹی سے خارج کردیے گئے۔ بعد میں انہوں نے صحافت کا شعبہ اختیار کیا اور پاکستان کے اہم اخباروں سے وابستہ رہے۔پاکستان کی حکمران اشرافیہ کو ناراض کرنے کے سبب کئی مرتبہ جیل گئے اور اب ایک عرصے سے انسانی حقوق کے لیے ان کی سرگرمیاں آج تک زور شور سے جاری ہیں۔

زیرنظر کتاب پاکستان میں انتہا پسندی کے پھیلاؤ کو روکنے اور بطور خاص نئی نسل کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے مختلف لکھنے والوں کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو ہیومن رائٹس کمیشن کے مختلف سیمیناروں میں پڑھی گئیں۔

مضامین کے اس مجموعے میں انتہا پسندی کے حوالے سے ریاست اور میڈیا کے کردار پر کئی لکھنے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ہمارا نصاب انتہا پسندی کے پھیلاؤ میں کس قدر منفی کردار ادا کررہا ہے، اس کا جائزہ ندیم عباس نے تفصیل سے لیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو جس نوعیت کا نصاب پڑھایا جارہا ہے اس سے وہ سماج کے مختلف عناصر سے جُڑنے کی بجائے، ان سے دور ہوجاتے ہیں، سماج دشمنی کم عمری سے ان کے ذہنوں میں جڑ پکڑ لیتی ہے۔

ملک کے تمام روشن خیال اور روادار افراد بار بار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ نصاب سے 'تاریخ' جیسے اہم موضوع کو خارج کر کے اور اس کی جگہ کسی اور نام سے مسخ شدہ تاریخ پڑھا کر جمہوریت پسند 'روادار انسان دوست اور انسانی حقوق پر یقین رکھنے والی نئی نسل کو زہر آلود کیا جارہا ہے۔

اس اہم ترین مسئلے کے بارے میں ندیم عباس نے کھل کر لکھا ہے کہ نصابی کتابوں میں مسلمان سپہ سالاروں کی ہندو راجاؤں کے خلاف عسکری مہمات کی جھوٹ پر مبنی مدح سرائی سے طالب علموں میں متشددانہ جذبات کو فروغ دیا جاتا ہے اور انھیں مذہب کے نام پر غیر مسلموں پر دھاوا بولنے کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔محمد بن قاسم، شہاب الدین غوری، سلطان محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی کی ہندو راجاؤں کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔

حالانکہ طلبا کو یہ بتانا چاہیے کہ مسلمان حکمرانوں نے جہاں ہندو راجاؤں کے خلاف جنگیں کی تھیں، وہیں وہ اپنے مخالف مسلمان حکمرانوں کے خلاف بھی صف آراء ہوئے تھے۔ظہیر الدین بابر نے برصغیر میں اقتدار کسی غیر مسلم سے نہیں بلکہ ایک مسلمان ابراہیم لودھی سے چھینا تھا اور اسے قتل بھی کیا تھا۔

زیرنظر کتاب پاکستان میں انتہا پسندی کے پھیلاؤ کو روکنے اور بطور خاص نئی نسل کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے مختلف لکھنے والوں کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو ہیومن رائٹس کمیشن کے مختلف سیمیناروں میں پڑھی گئیں۔

اسی طرح شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی تھی جو کہ غیر مسلم نہیں تھا۔اورنگ زیب اپنے مسلمان باپ کو تا مرگ زنداں میں ڈال کر اور اپنے بھائیوں کو قتل کر کے مسند اقتدار پر بیٹھا تھا۔یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ درحقیقت اقتدار کی جنگ تھی جس کو ہماری نصابی کتابیں مذہبی لڑائی کے طور پر بیان کرتی ہیں۔

وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ خیبر پختونخوا میں جماعت ہفتم کی اردو کتاب میں علم دین کو بطور ہیرو پیش کر کے تضحیک مذہب کے ملزم کے قتل کی حوصلہ افزائی کی گئی اور قاتل کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ خواتین ہیروز میں صرف فاطمہ جناح اور بیگم رعنا لیاقت علی شامل ہیں گویا ان دو کے علاوہ گزشتہ 62 برسوں میں پاکستان کوئی بڑی خاتون شخصیت پیدا نہیں کرسکا۔ان میں سے بھی رعنا لیاقت علی خان کا صرف ایک بار جب کہ فاطمہ جناح کا محض چار بار ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارا نصاب پاکستان کے کسی غیر مسلم کو بھی بطور ملکی ہیرو پیش نہیں کرسکا۔ پاکستان کو نوبیل انعام کا اعزاز دلوانے والے ڈاکٹر عبدالسلام، 1971ء کی جنگ میں ملک کا دفاع کرنے والے گروپ کیپٹن سیسل چوہدری اور میرون مڈلکوٹ، معروف قانون دان جوگندر ناتھ منڈل، جسٹس اے کے کارنیلیس، جسٹس رانا بھگوان داس، اردشیر کاوس جی، جولیس سالک، پسی سدھوا میں سے کوئی بھی ہمارا قومی ہیرو نہیں ہے۔

نہ ہی دیوان بہادر ایس پی سنگھا، فضل الٰہی اور سی ای گبن ہمارے ہیرو ہیں جنھوں نے 1947ء میں پاکستان کی حمایت میں ووٹ ڈالے تھے۔محض اس وجہ سے وہ ہمارے ہیرو نہیں کیونکہ وہ غیر مسلم تھے۔

آگے چل کر اس رپورٹ میں ایک کالم نگار حسن گیلانی کی ایک تحریر دی گئی ہے، جس میں انہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور سے شایع ہونے والے معروف روزنامے ''پیسہ اخبار'' کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم کے اس سفرنامے کا اقتباس نقل کیا ہے، جو انہوں نے 1905ء میں یورپ کے سفر کے بعد لکھا تھا۔اس اقتباس سے مسلم دنیا کی اس پسماندگی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جو آج بھی اس کا مقدر بنا ہوا ہے۔منشی محبوب عالم لکھتے ہیں۔

''یورپ کے جس ملک میں بھی گئے، وسیع وعریض، صاف ستھری سڑکیں بڑی بڑی عمارتیں، کالج، یونیورسٹیاں، اسپتال اور ہر طرف بڑے بڑے کارخانے اور ان کی اونچی بلند و بالا دھواں اگلتی چمنیاں دیکھیں۔جب ہم فرانس پہنچے تو وہاں ان دنوں صنعتی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔جب ہم نمائش میں پہنچے تو یورپ کے تقریباً ہر ملک کی نمائندگی تھی۔

چمڑا سازی، شیشہ سازی، گھڑی سازی، کارسازی و جہاز رانی کے علاوہ برقی آلات و زراعت تک جدید صنعت وحرفت کے شاہکار دیکھنے کو ملے۔اسی دوران ایک کونے میں موجود اسٹال پر برادر اسلامی ملک ترکی کا بورڈ پڑھا تو بے انتہا خوشی ہوئی کہ ممالک اسلامیہ میں کوئی تو ہے جسے جدید دور کے تقاضوں کا احساس ہے۔یہی سوچتے ہوئے جب ہم وہاں پہنچے۔اس یہ لحاتی خوشی کا احساس دکھ اور مایوسی میں تبدیل ہوا جب وہاں جدید صنعت وحرفت کی جگہ قدیم تلواریں، توڑے دار بندوقیں، زرہ بکتر اور چند شاہی لباس آویزاں دیکھے۔''

منشی محبوب عالم آگے کا حال یوں لکھتے ہیں ''جب ہم یورپ کی حدود سے نکل کر اسلامی ممالک کی حدود میں داخل ہوئے تو وہاں کارخانوں کی دھواں اگلتی اونچی چمنیوں کی جگہ ہر طرف بڑی بڑی مساجد اور ان کے اونچے فلک بوس مینار دیکھنے کو ملے۔''

آج ایک صدی گزر جانے کے بعد اس سفرنامے کی روشنی میں مسلم دنیا پر نگاہ ڈالیں تو وہ تصویر جو منشی محبوب عالم نے اپنے مذکورہ سفر نامے میں پیش کی تھی، اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آئے گی۔

اس مضمون میں سید سبط حسن کی تحریر کا اقتباس بھی شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے کھلم کھلا لکھا ہے کہ ظلمت پرست خدا کی حاکمیت کی آڑ میں تنگ نظر ملاؤں کا راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔فیوڈل ازم اور فیوڈل قدروں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔221 صفحوں پر مشتمل یہ ریویو ایسے ہی خیالات وافکار کا احاطہ کرتی ہے۔اس کی ترتیب وتدوین کے لیے حسین نقی اور آئی اے رحمان صاحبان قابل مبارکباد ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

جہد حق پڑھنے والوں کے خطوط

ہمارے بچوں کو ہندی اور گیتا پڑھائی جائے

بہاولپور پاکستان کے لاکھوں غیر مسلم طلبہ آج بھی نصاب میں اپنے مذاہب اور تاریخ سے متعلق متعصّبانہ مواد پڑھتے ہیں اور اس کے علاوہ بیشتر جگہوں پر انھیں نصاب میں اسلامیات ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے جس میں ان کے اپنے مذاہب سے متفرق مواد موجود ہوتا ہے۔صحرائے چولستان میں میری ملاقات ایک ہندو آدت رام سے ہوئی جن کے بچے ان کے گھر سے ملحق ایک کمیونٹی سکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔انھیں شکایت ہے کہ ان کے بچوں کو سکول میں ہندو مذہب کے بارے میں تعلیم کے بجائے اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔'ویسے ہم ہیں تو ان پڑھ، لیکن اپنے ویدوں میں جو کچھ ہم نے سنا، وہ بتاتے ہیں تاکہ بچوں کی مذہبی تعلیم کی بنیاد بن جائے کہ ہمارا مذہب کیا ہے، ہم کون لوگ ہیں اور اس دنیا میں ہم کیا کرنے آئے ہیں۔ہم ہندو ہیں تو ہم کو ہندی پڑھائی جائے، بھگوت گیتا پڑھائی جائے، شاستر پڑھائے جائیں، گرنتھ پڑھائی جائے۔' آدت رام کا خاندان دیگر 17، 16 ہندو خاندانوں کے ساتھ صحرائے چولستان کے ایک دور دراز علاقے میں مقیم ہے۔علاقے میں پڑنے والی شدید گرمی اور مرکزی سکول کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے مقامی حکام نے قریب ہی ان کے بچوں کے لیے ایک کمیونٹی سکول کھول دیا ہے جہاں نرسری سے تیسری جماعت کے 47 بچے زیرِ تعلیم ہیں۔سکول کے واحد استاد ارجن رام کہتے ہیں کہ انھوں نے خود بھی اسلامیات پڑھی ہے اور نصاب کا لازمی حصہ ہونے کی وجہ سے ان بچوں کو اسلامیات پڑھانا ضروری ہے۔'بنیادی طور پر یہ ایک علم ہی ہے۔عربی ایک زبان ہی ہے۔اس میں اسلام میں دیا جانے والا امن کا پیغام ہی ہے لیکن اگر ان بچوں کو اسلامیات کی جگہ ایک کتاب ہوتی ہے اخلاقیات، وہ پڑھائی جائے تو بہتر ہوگا۔ہمارے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔'

تیسری جماعت کی اخلاقیات

'تیسری جماعت کے مسلمان بچے کی اسلامیات کی کتاب میں ناظرہ، قرآن اور حفظِ قرآن شامل ہے جبکہ تیسری جماعت کے لیے اخلاقیات کی کتاب میں ارتقائی مذاہب کا تصور، قدرتی مظاہر کی پوجا، آسمانی دیوتا، زمین کی دیوی اور دیوتا، دیوی دیوتاؤں کے قصے، شکار کی دیوی، فصل کی بوائی اور کٹائی کا دیوتا، بائیبل کے قصے کہانیاں، سزا دینے والی دیوی، اشیاء میں روح کی موجودگی، جادو کا زمانہ، اشیا پرستی جیسے موضوعات شامل ہیں۔' حکومتِ پاکستان نے 2007 میں قومی تعلیمی پالیسی تشکیل دی تھی جس کے تحت ملک کے تمام تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم غیر مسلم طلبہ کے لیے نصاب میں اسلامیات کے بجائے اخلاقیات کا مضمون تشکیل دینے کی ہدایت کی گئی تھی تاہم آٹھ سال بعد بھی اس پر مکمل عمل درآمد نہیں ہو سکا۔پاکستان میں اقلیتی مذاہب سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کی تنظیم آل پاکستان مائنورٹیز ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر انجم جیمز پال کے مطابق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے تیسری جماعت سے لے کر سیکنڈری، میٹرک اور انٹر کے غیر مسلم طالبعلموں کے لیے اخلاقیات کی کتابیں شائع کر دی ہیں لیکن اُس میں شامل مواد پر انھیں اعتراض ہے۔انجم جیمز پال کا کہنا تھا کہ انھوں نے دسمبر میں وزیرِ اعظم سمیت چیف جسٹس سپریم کورٹ کو خطوط لکھے ہیں جس میں انھوں نے کہا ہے کہ 'نیشنل ایکشن پلان کے تحت ملک میں شدت پسندی اور مذہبی ظلم و ستم کو فروغ دینے والے تمام مواد کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔' قومی اسمبلی میں اقلیتیوں کے نمائندہ رکنِ رمیش کمار وانکوانی نے بتایا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے وہ خود چاروں صوبوں کے سیکریٹری تعلیم کے ساتھ مل کر غیر مسلموں کے لیے نصاب میں دیگر مذاہب سے متعلق نفرت انگیز مواد ختم کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں تمام اقلیتی مذاہب سے تعلق رکھنے والے ماہرین تعلیم سے بھی مشاورت بھی کی جاتی ہے۔رمیش کمار نے بتایا: 'سندھ حکومت نے پہلی سے پانچویں تک کتابیں تبدیل کر لی ہیں اور وہاں کام جاری ہے لیکن ابھی تک وہ نصاب میں شامل نہیں ہوئی ہیں۔بلوچستان میں بھی یہ کام نہیں کیا جا سکا ہے لیکن وہاں تعلیمی نصاب میں مذہبی نفرت پر مبنی مواد اتنا نہیں ہے۔خیبر پختونخوا حکومت نے اب تک اس سلسلے میں کوئی کام نہیں کیا ہے۔' انھوں نے اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے ماہرِ ین تعلیم کو دعوت دی کہ وہ تشکیل دیے جانے والے نئے نصاب اور اخلاقیات کی کتاب میں مسائل کی نشاندہی کریں تاکہ اِن کتابوں کی اشاعت سے قبل ہی غلطیوں کو درست کر لیا جائے۔

(بی بی سی اردو)

طویل لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری

بنوں بنوں میں 18 سے 22 گھنٹے کی طویل لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری ہے۔گھروں اور مساجد میں پانی ناپید، کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بنوں کے شہری علاقوں میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ 16 سے 18 گھنٹے تک پہنچ گیا جبکہ دیہی علاقوں میں 20 سے 22 گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کی جارہی ہے جس کی وجہ سے عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ گھروں میں پینے کا صاف پانی جبکہ مساجد میں وضو تک کیلئے پانی ناپید ہو گیا ہے۔ایسوسی ایشن کے صدر سجاد خان زرگر، فداء اللہ خان، حاجی طارق خان، ٹانچی بازار کے صدر سید عدنان ہاشمی اور دیگر نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بنوں میں بجلی کی فراہمی کیلئے گرڈ سٹیشنوں میں ہیوی ٹرانسفارمر فراہم کر دیئے گئے ہیں جبکہ تقریباً ہر علاقے کیلئے بھی الگ فیڈر نصب کر دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود بنوں میں 22 گھنٹے کی بجلی لوڈ شیڈنگ اور کم وولٹیج کا مسئلہ برقرار ہے۔

(نامہ نگار)

کراچی میں ماورائے عدالت ہلاکتوں میں پانچ گنا اضافہ

کراچی پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے ایک اہلکار کا کہنا ہے کہ کراچی میں پچھلے ڈھائی برسوں میں ماورائے عدالت ہلاکتوں میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔ایچ آر سی پی کے سندھ کے لیے وائس چیئر پرسن اسد اقبال بٹ نے بی بی سی اردو سروس کو بتایا کہ 'بالکل اسی طرح جس طرح بلوچستان میں لوگوں کو مار کر پھینکا جا رہا تھا۔اب وہی طریقہ کار یہاں پر سندھ میں کراچی میں بھی رائج ہو گیا ہے۔' انھوں نے کہا کہ '2012 میں مبینہ مقابلوں اور حراست کے دوران 118 اموات ہوئیں جو 2013 میں بڑھ کے 193 ہو گئیں اور 2014 میں ان ہلاکتوں کی تعداد 621 ہو گئی جبکہ اس سال کے پہلے چھ ماہ کے دوران ان مقابلوں میں 348 افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔' انھوں نے کہا کہ قانون نافذ کرنے والے سیاسی کارکنوں کو اٹھا رہے ہیں اور ان پر تشدد کر کے انھیں جان سے مار کر پھینک رہے ہیں۔کراچی میں رینجرز کی قیادت میں جاری آپریشن کے نتیجے میں حکام کے مطابق حالیہ مہینوں میں سٹریٹ کرائم سے لے کر اغوا اور ٹارگٹ کلنگ تک کے واقعات میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے مگر ماورائے عدالت ہلاکتوں کے الزامات سے بحالی امن کی کوششوں پر پھر سے سوالات اٹھنے لگے ہیں۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

repaired, and seeds and fertilizers made easily accessible.

Environmentally sustainable human settlements should be established and populated with people who had to resort to living in the perilous floodplains. Tampering with the river flow is another factor that leads to escalation of floods. Illegal dykes and irrigation channels need to be removed to restore the natural flow

Population affected by the 2015 floods

Balochistan	Gilgit Baltistan	Khyber Pakhtunkhwa	Punjab	Sindh	FATA	Total
69,976	35,717	Being assessed	463,902	1,001,696	900	**1,572,191**

Source: NDMA Report 2015

Of the rivers. However, much political will and effective resource mobilizations is needed to undertake these steps. Resource mobilization might be the easier of the two to generate.

Health

This year the number of flood affected has fortunately been lower than in the floods in the preceding years, but health concerns for the flood affectees have still come to surface not just for those in the relief camps but also the people in affected residential areas. There have been some reports of people living in inundated areas suffer from snakebites, malaria, skin problems, respiratory issues, diarrhea, and other waterborne diseases. Some of the health problems have been said to be exacerbated by a lack of safe drinking water and sanitation facilities. Diseases are known to spread in many affected areas because people often have to resort to open defecation. An important other aspect of health that the authorities have neglected year after year is the trauma caused by floods. Psycho-social trauma counseling services are required at a large scale to cater to the flood affected families across Pakistan.

Health problems among women are known to be exacerbated because of social demarcation. In previous years, it has been reported that not enough women medical and paramedical personnel were available, which compromised women's access to healthcare. Since many of the flood-affected people belong to conservative communities, they do not allow male medical practitioners to treat women. Even more urgent are the needs of women who are pregnant and expecting delivery before returning to their homes. As a lot of them take refuge at camps, temporary shelters, and even in roadside huts, the government needs to take the necessary steps to provide them pre- and post-natal care. Over the last few years, reports of women facing issues such as forced prostitution, sexual abuse, and trafficking have also emerged and need to be addressed.

Raising awareness about floods and imparting all concerned people with the necessary skills to survive in harsh conditions is essential. Rescue trainings for humanitarian workers and volunteers can also prove to be useful.

Education

Every year, large parts of the population displaced by the floods find shelter in government schools as the schools are usually closed during the flooding season on account of summer vacations. The conflict-displaced in the northwest being housed in schools in 2014 had led to challenges in timely resumption of education after the summer vacations. Therefore, it is imperative that the displaced are housed in appropriate shelter and not just put up in schools.

Since a lot of schools are also destroyed in floods each year, the rehabilitation plan should include swift rebuilding of educational infrastructure so that children can resume their studies. As a temporary solution, camp schools can be set up and parents motivated to allow their children to continue their education.

Civil society organizations and international donors continue to play a pivotal role in providing relief, but it is primarily the government's responsibility to help the affected people. The latest National Flood Protection Plan appears to be quite comprehensive and seems to cover many of the aforementioned concerns. However, its effectiveness will depend on how it is implemented.

Better coordination among government departments is also needed to cope with floods, which are likely to exacerbate over the next few years. In the absence of a holistic approach, the efforts made by government departments would remain largely ineffective. With improved coordination among national and provincial authorities and between the government and national and international humanitarian agencies, Pakistan's disaster response is likely to become more effective and efficient.

Appropriate alerts

Although the National Disaster and Management Authority (NDMA) did issue advance warnings and alerts for many flood-affected areas, but experts at a consultation organized by the Human Rights Commission of Pakistan noted that despite Pakistan's capability to forecast flashfloods 24 to 48 hours in advance NDMA often failed to respond in a timely manner.

Houses damaged by floods in 2015

Balochistan	Gilgit Baltistan	Khyber Pakhtunkhwa	Punjab	Sindh	FATA	Total
1,176	812	4,799	3,096	Being assessed	424	**10,407**

Source: NDMA Report 2015

According to an official of the Punjab Provincial Disaster Management Authority (PDMA), part of the problem lies in Pakistan's inadequacy in delivering effective emergency services and management.

Most at risk

Landless rural poor remained the worst hit group. While all affected people suffer losses and face difficulties, the already marginalized groups, such as the landless, and religious minorities, become more vulnerable. Reports of marginalized groups facing discrimination at relief camps have also emerged over the past years.

Being proactive

Rather than just responding to natural disast er like floods, the authorities need to assess the risks and be prepared to respond quickly in vulnerable areas. The government and NDMA have been criticized for making short-term efforts. While steps should be taken to provide immediate rescue and relief to the affected people, the government must also realize that long-term solutions need to be adopted with urgency.

Heeding advice

While the recurring floods present a difficult challenge, it is by no means insurmountable. After the floods in 2010, Pakistan had invited the Ramsar Advisory Mission to seek advice on how the devastation caused by floods can be curtailed. One of the key conclusions reached by these experts was that like China, which successfully tackled floods along the Yangtze River, Pakistan should restore and strategically use

Villages affected by floods in 2015

Balochistan	Gilgit Baltistan	Khyber Pakhtunkhwa	Punjab	Sindh	FATA	Total
Being Assessed	286	Being assessed	586	3,203	19	**4,094**

Source: NDMA Report 2015

Wetlands. They had also suggested that erosion should be reduced by banning logging and restoring forests.

Beyond rescue

Every year, media reports show boats and helicopters being used to rescue people, and officials handing out food packages and other relief good to the affected people, but little is heard of the government's plan for their rehabilitation. Every year floods destroy houses, hospitals, schools, roads and other infrastructure. People often remain cut off from other parts of the country for long periods and lose their crops, cattle and livelihoods. Many people are forced to borrow money and are burdened with debt. With successive floods pummeling the country, it is difficult to pay off the debt. Many of the evacuees return to the floodplains after receiving aid from the government and repeat the whole cycle of events every year. A more viable and permanent solution is to provide them with avenues of sustainable livelihood.

Most of the affected persons work on agricultural lands so restoring them should be the government's primary area of focus. To do so, inundated farmlands have to be dewatered, associated infrastructure

Another Flood | Another Catastrophe

Pakistan has been no stranger to floods, but raging rivers have taken a particularly heavy toll on human lives and infrastructure each summer since 2010. Every year since then the reach and impact of the floods has caused new causes for concern, inundating residential areas and farmland, displacing large communities and destroying their homes, livelihoods and infrastructure. Experts have partly attributed the increasing devastation that the floods have been causing from June to September each year to climate change.

According to a report issued by the National Disaster Management Authority (NDMA) on September 3, 2015, more than 1.5 million people, 4,094 villages and tens of thousands of acres of farmland were affected by the floods in 2015. A total of 228 persons, including 61 children, lost their lives and 207 people were injured. Over 10,000 houses were damaged. The affected populations, especially in the rural areas, have been vulnerable to malnutrition and disease. Punjab, Khyber Pakhtunkhwa and Sindh faced the greatest extent of flooding this year. Some previously unaffected areas were also inundated this year. The worst affected was the Chitral region in northwestern Pakistan, where monsoon rains was previously unheard of but this year they dumped so much water in such a short time that rivers and streams burst their banks.

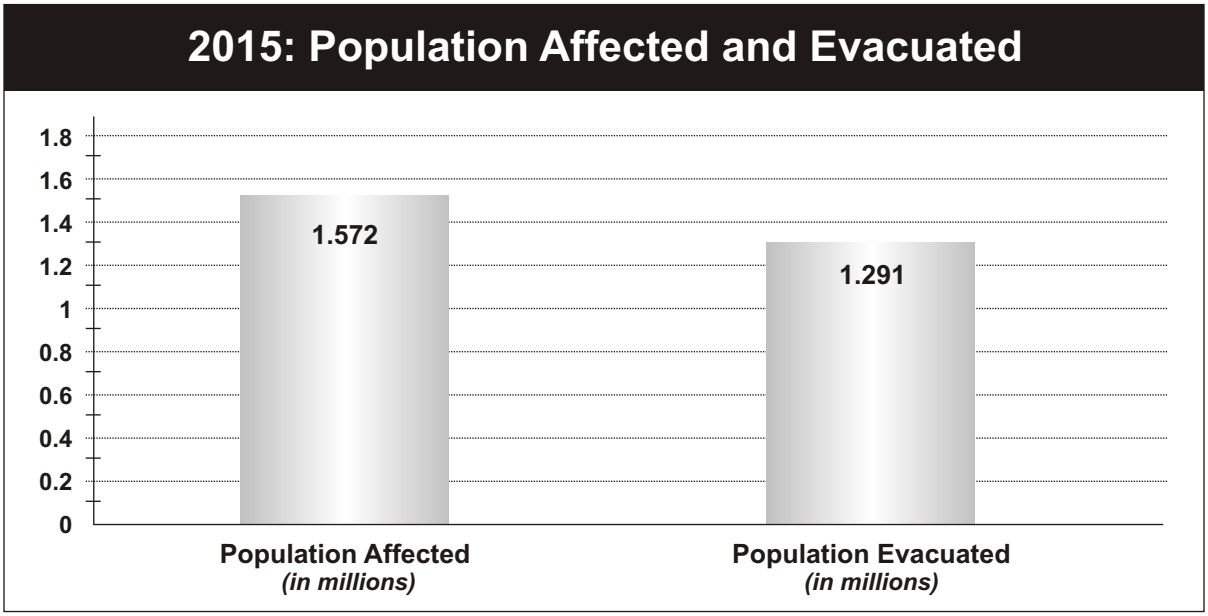

For a home outside the floodplains

Many people in the plains have been affected by the floods because of encroachment of the floodplains along the riverbanks. The people living in these areas move back to the floodplains every year after the floods subside. A law is being drafted to tackle the encroachment of floodplains.

The government must also focus on flood risk management. The number of people who face the risk of floods every year can be brought down significantly by mapping floodplains and making sure that people are moved out of there. The challenge in taking this initiative would be to provide alternative housing to the people who have to resort to making these precarious floodplains their home.

Some of the flood-affected families shared stories of their suffering with the media and said that they were still trying to recover from their losses in the floods the previous year when they were hit by yet another devastating flood. However, many people were not willing to move too far away from the affected areas because their assets were tied to the flooded farmlands.

Some of the emblematic cases reported to HRCP during this period are as follows:

- On January 8, a journalist (Malook Abbasi) working for daily Sobh in Naushero Feroz, Sindh was threatened by the local assistant commissioner for reporting about the local land mafia. The commissioner reportedly told the journalists that he could be killed or implicated in a case if he did not stop his reporting against the land mafia
- In Bahawalpur, on January 10, several policemen at Civil Lines Police Station tortured Chaudhry Saleem, the bureau chief of a private news channel (Royal TV), by beating him. The journalist said that he was beaten up and tortured because a report he had filed for the news channel had been critical of a deputy superintendent police (DSP). A case was registered against the perpetrators.
- In **Matiari** district of Sindh, on May 14, policemen told a reporter (Rajib Buzdar) working with Dharti TV to stop filming a police raid on a private party when policemen were beating up those present. The reporter was severely beaten up when he did not oblige.
- In Naushero Feroz, on June 4, members of the land mafia threatened Qurban Gadhi, a journalist working for Sahity Awaz weekly, after the periodical published one of his stories about the land mafia demolishing a Hindu graveyard near Halani city. Several armed men entered Jokhyo's house on June 4, stole valuables and abducted his son. They released him after three hours and threatened the family with dire consequences if further reports about the land mafia's activities were printed. The land grabbers connived with the police and through the Anti-Terrorism Court (ATC) acquired an order against Gadhi and his editor, Ikhlaq Jokhyo. Both journalists have secured their bail from the Sindh High Court.
- In June, three journalists in **Dadu district** working for Sindhi language daily newspaper Kaawish and KTN News TV channel were attacked in village Jalib Laghari by a local landlord and his henchmen for filing a report about his alleged involvement in land grabbing. They slapped and hit the journalists with rods, injuring them. Some villagers alerted the police who rescued the journalists and filed a case against the landlord and one of his sons.
- On June 14, Zahib Zardari, a TV programme anchor, was beaten by police in Nawabshah apparently for criticizing the government during a show. A day after the show aired on Awaz TV and Sindh TV, 10 policemen, along with some men in plain clothes believed by the family to be policemen as well, raided his house, and beat up the journalist and his family. They also took away the journalist's son and left him at some distance from the house after beating him. The journalist tried to file a complaint, but the police refused, saying that no such raid had occurred. The journalist continued to receive threats from local land owners affiliated with a political party and chose to leave the area with his family.

Amid increasing vulnerability of media persons, it is imperative that effective legislative framework and security protocols are put in place. It is the responsibility of the government to protect, preserve and facilitate journalists' role and raise awareness at the societal level of the important role journalists play in building a democratic society. The government should also ensure due process of law and proper investigation and prosecution to end impunity enjoyed by perpetrators of violence and threats against journalists. Furthermore, the government's actions should be guided by recommendations it received and accepted on different international forums, including at Pakistan's last Universal Periodic Review in 2012.

The capture and conviction of the murderer of Wali Khan Babar is a step in the right direction. However, such a response to the targeting of journalists should be the norm rather than the exception.

Continuation of a grim trend

In all the lists of the most dangerous countries for journalists in the world published in the last few years, Pakistan's name has sadly appeared on or near the top. According to South Asia Terrorism Portal, an online database on terrorism, 46 journalists have been killed in Pakistan on account of their word over the last decade. As many as 14 journalists and media workers were killed in 2014 alone on account of their work.

The news media has been under attack not only from political and religious zealots but also from the state apparatus.

The state's failure to address the security challenges aside, its commitment to end impunity can be judged from the fact that of all the journalists and media workers killed over the last decade, the murderers of only two have been convicted; Daniel Pearl of the Wall Street Journal and Wali Khan Babar of Geo News.

After Wali Khan Babar was murdered in Karachi January 2011, it took the justice system four years to find and convict the main accused in the case. During this period, many witnesses and police investigators in the case had been murdered. The accused, Faisal Mehmood, was arrested in March this year from a political party's office and was also alleged to have been associated with that party. His arrest came at a time when the political party in question was being cornered, leading those working on media freedoms to conclude that journalists and their families would only get justice if the perpetrators and their backers suffered political isolation or falling out.

According to HRCPs figures, documented from 60 of the most volatile districts of Pakistan, 10 incidents of intimidation of journalists was reported in the first six months of 2015.

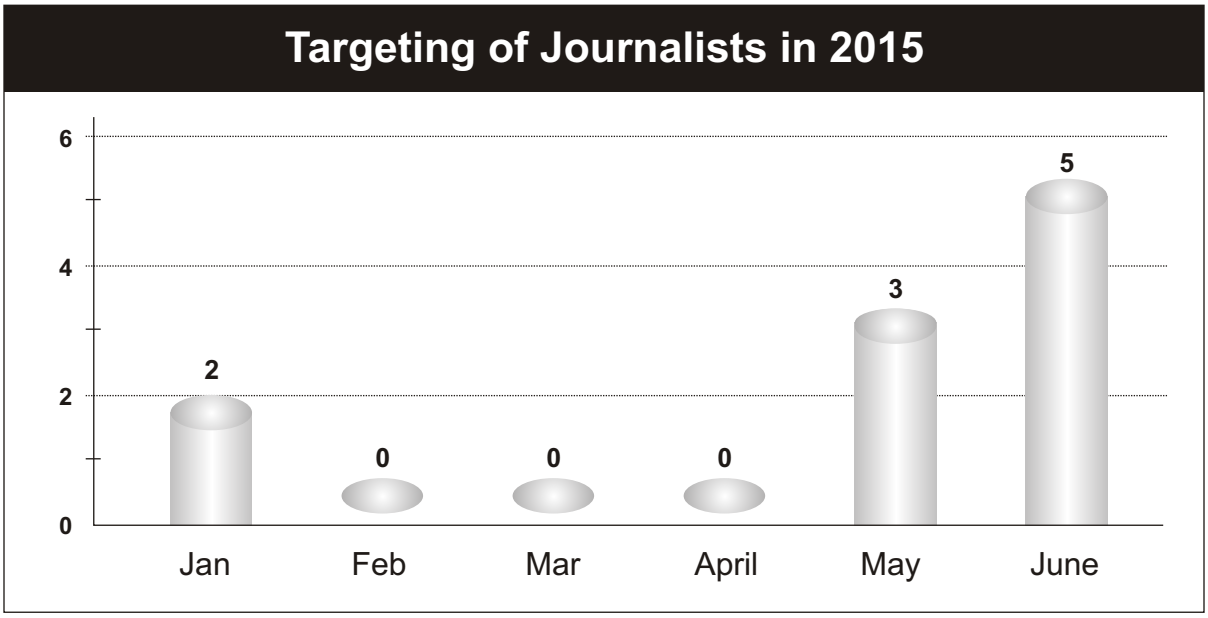

According to HRCP's media monitoring, 139 incidents of gang-rape and 297 incidents of rape were reported against minors in 2014. According to Sahil, a civil society group working to highlight child abuse in Pakistan, 3,500 cases of child molestation were reported in 2014; as many as 67% of them occurred in rural areas.

- **7 to 8 months ago** — Existence of pornographic tapes became publicly known when a victim shared his phone's memory card with a local shopkeeper.
- **Between May and August** — Cases registered with police. No action taken.
- **First week of August** — Clash between police and villagers who were demanding action against the suspects.
- **August 8** — Seven suspects arrested.
- **August 9** — Punjab government inquiry committee declares molestation scandal baseless.
- **August 11** — HRCP-AGHS joint fact-finding visit to the village
- **August 11** — Joint Investigation Team (JIT) formed by the government
- **August 13** — JIT starts investigations
- **August 15** — 10 victims taken from the village to the city for medical examination
- **August 19** — HRCP-AGHS fact finding mission report published
- **August 20** — Five more suspects arrested by police in Bhakkar district.

According to Article 4 of UNCRC, signatory states are under an obligation to undertake all appropria te legislative, administrative and other measures for the implementation of the rights recognized in the convention. In its report to the UNCRC in 2009, Pakistan's National Commission for Child Welfare and Development stated that a National Child Protection Policy had been drafted and was in the final phase of adoption. However, this policy has not been adopted. Also, the federal government was yet to pass the National Commission on the Rights of Children Bill while the Punjab government was yet to pass a child protection policy amid confusion regarding which department would have administrative control.

In the Kasur case, arrests were made within days of the incident coming to light. The five-member JIT had set up office in Kasur to collect evidence and present a report to the LHC within a fortnight. The Kasur district police had set up a special desk for volunteers, victims and witnesses in order to record their statements and forward them to the JIT.

Commendable as these steps might be in ensuring that the perpetrators of the heinous crime in the Kasur village are brought to justice, effective steps are urgently needed to prevent more children there and elsewhere from falling prey to sexual violence and exploitation. The fact-finding mission's recommendation that NGOs should collaborate to hold counseling and awareness sessions in the village should be heeded. In a statement, Phillipe Cori, UNICEF Regional Deputy-Director for South Asia has said: “It is vital that the children and families affected are immediately offered the necessary care and protection that will prevent further victimization and allow the difficult process of healing to begin.”

None of the actions that have been taken, or should be taken, by civil society organisations absolve the authorities of their obligation to the nation's children. The state would be judged not only on its performance in bringing the perpetrators to justice and rehabilitating the children, but also in implementing urgent and effective mechanisms to ensure protection of Pakistan's children from sexual and other exploitation and violence.

- The wide circulation of the video clippings and rumors going around the village preceding the registration of cases connected to this scandal could and should not have escaped the notice of the police for so many months.
- The behavior and conduct of the previous SHO at the police station did not appear to be above board. Many families implicated the police also in the campaign of intimidation that intensified after the whole scandal came in public view. The team also noticed that the staff members of police station that spoke to the team were visibly on their guard and unwilling to give full information on the investigation of the case.
- The team noticed the absence of any effective investigation by the police till the time of the fact-finding visit. No witnesses had been examined, no evidence had been collected from the reported sites of abuse. Even the objectionable videos that were circulating in the village had not been confiscated.
- The police could not give a satisfactory account of their action to secure and preserve evidence or to prevent further circulation of objectionable video clippings. A TV channel reportedly had unhindered access to one of the crime scenes, i.e., the '*haveli'* of the accused and had filmed what it claimed to be implements used in the crime. This indicated gross incompetence of the police and also their non-serious attitude in investigating the crime.
- The team heard the complaint of several people that local politicians were pressurizing the police to downplay the occurrence. None of these complaints, however, were specific to any one personality. The team could not collect any specific information that allowed it to make a conclusive finding of using political influence against any one person or group in favor of the accused… It was, nevertheless, true that the behavior of the police and public statements made by some of the political leaders cast a doubt on their commitment to ensure that justice was done to the victims and that serious measures were taken to prevent further harm to them and their families. The Punjab law minister, for instance, tried to dismiss the whole incident as a fabrication instigated by persons with a vested interest in a land dispute in the village.
- The team found the role of the political parties and their leadership very disturbing. It saw leaders and workers of some of the political parties. All of them made inflammatory speeches against the provincial government. They paid little attention to the need for protection of the children against abuse and exploitation. Not a single one of them raised any social issues of concern, nor spoke about any efforts that they would make for better legislation or policy for child protection. The team could only conclude that their main aim was to use the situation to discredit the government and that none of the political leadership who visited the village played any constructive role in assuring justice for the victims.
- The team found the total disregard for the physical and psychological impact of the abuse on the victims very distressing. None of those that the team met, including the parents, raised any concerns in this regard with the team. Suggestions by team members that the children should receive proper medical attention and psychological counseling were given no serious attention by the families of these children, nor those who were leading their pursuit for justice against the accused.
- There was no discussion in the village on what needed to be done to assure that such criminal activity must to an end and must never be repeated.
- No NGOs or practitioners with expertise in dealing with the trauma of abuse was engaged in rehabilitative programme in the village.

Despite Pakistan's ratification of the United Nations Convention on the Rights of Children (UNCRC) in 1990, it is a matter of concern that effective measures have not been taken to prevent such systematic and gross abuse of children. Under Article 34 of the Convention, Pakistan undertook to protect its children from all forms of sexual exploitation and sexual abuse and particularly to take all appropriate measures to prevent the exploitative use of children in pornographic performances and materials.

Letting our children down

Almost eight months after Pakistan committed to take action to end online child sexual exploitation during the We PROTECT Children Online summit, a grave saga of sexual abuse of children came to light in Kasur district of Punjab.

Different media sources have reported that a criminal gang in Hussain Khanwala village in Kasur had engaged in sexual abuse of children spanning several years, filming the act and then either selling the video clips or blackmailing the victims and their families for money. The media reports put the number of abused children between 250 to 280 with almost 400 video recordings. The media, as well as the local police, stumbled upon what appeared to be systematic abuse of children when the victims' families protested against the failure of the police to register a case in the first week of August. Some media reports suggested that the victims' families were being intimidated by police, either because of a possible collusion with the perpetrators or in an attempt to hush up the matter because of how it reflected on police performance. In subsequent days, senior government officials, including the Punjab law minister, claimed that the number of victims was exaggerated and that a property dispute was at the heart of the entire issue.

In light of the seriousness of the incident and lack of clarity on the facts of the case, the Human Rights Commission of Pakistan (HRCP) and AGHS Child Rights Cell constituted a joint nine-member team to conduct a fact-finding mission and ascertain the facts. On August 11, the team, visited the village and met the victims' families, and local policemen. The fact-finding team was led by Hina Jilani, Advocate, member of HRCP Executive Council and Director of AGHS Child Rights Unit, and formerly UN secretary-general's representative for human rights defenders. The other members of the team were journalist Waqar Gilani and representatives of HRCP, AGHS and Aurat Foundation. The main findings of the team included the following:

- The mission received credible testimonies indicating large-scale sexual abuse of children over many years, at least since 2010. According to the team's estimate, most of the victims were between 10-16 years of age.
- The team estimated that several hundred video clippings depicting scenes with sexual activity with children existed. The team could not, however, give a conclusive estimate of the number of children involved. The heinous crime committed against children made the exact number of victims irrelevant. The incidents involved several children from the same village and from the same neighborhoods, in some cases.
- The team took note of some media reports and comments by the police that the scandal might have been concocted by one party against another in the village who were supposedly contesting the ownership of a piece of public land. In the presence of clear and convincing evidence that a heinous crime against children of the village had occurred, the issue of the land became irrelevant in the context of the duty of the state to investigate and to take all necessary measures to protect these children and young persons from exploitation. It was possible that persons with ulterior motives were opportunistically using this scandal to further their interests. However, that must not overshadow the urgent need to address the complaints by victim families and to ensure that honest and impartial investigation and prosecutions were carried out against those named as accused.
- The team heard credible testimonies from victim children and their families and believed that this crime remained concealed largely because extortion money was paid either by the children or their families to the accused. It was evident that some evidence of the extortion and blackmail existed.

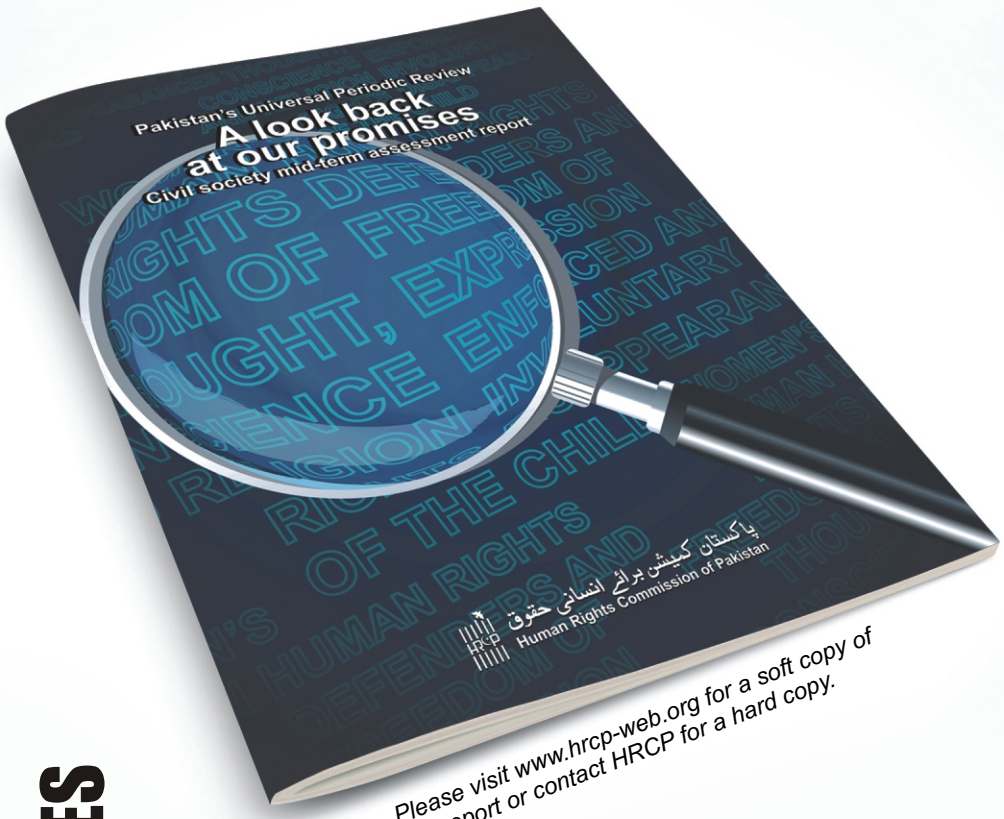

Please visit www.hrcp-web.org for a soft copy of the report or contact HRCP for a hard copy.

Pakistan's Universal Periodic Review
A LOOK BACK AT OUR PROMISES
Civil Society mid-term assessment report

N O W A V A I L A B L E

The Universal Periodic Review (UPR) is a state-driven process created by the UN General Assembly that reviews the human rights records of all UN member states once every four to five years, providing an opportunity for states to demonstrate what actions they have taken to improve the rights situation in their countries.

The UPR reminds states of their responsibility to fully promote and respect all human rights within their jurisdiction, aiming to identify human rights violations wherever they occur, supporting states to rectify them, and improving the human rights situation in all countries.

Pakistan went through its second UPR in October 2012. During the review, Pakistan received 167 recommendations, out of which it accepted 126, 'noted' 34, and rejected seven. At the mid-term phase of the review cycle, HRCP presents an assessment of the implementation of recommendations that Pakistan accepted related to five thematic areas: women's human rights; rights of the child; freedom of thought, conscience and religion; human rights defenders and freedom of expression; and enforced and involuntary disappearances.

The report is based on national consultations HRCP organised, in collaboration with the International Commission of Jurists (ICJ), over the course of six months on each thematic area with national civil society organizations, lawyers and human rights activists to record their input on the government's response to accepted recommendations thematically.

جبری گمشدہ افراد کو زندہ بازیاب کرایا جائے

Recover the missing alive

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق Human Rights Commission of Pakistan

Families, activists demand an end to

Enforced Disappearance

On the International Day of the Victims of Enforced Disappearance on August 30, HRCP held a consultation in Islamabad and HRCP offices and volunteers across the country held demonstrations and events to call for bringing an end to the disappearance in the country and to recover and rehabilitate all missing persons. Participants at the Islamabad consultation included Asma Jahangir, Senator Jahanzaib Jamaldini of the Balochistan National Party, representatives of civil society organisations and families of enforced disappearances victims from all parts of the country. The participants demanded that Pakistan ratify the UN Convention on Enforced and Involuntary Disappearances, end the impunity for this heinous crime and prosecute those responsible. The consultation was followed by a demonstration outside the Islamabad Press Club.

A call to honour disabled persons' rights

On August 1, the Human Rights Commission of Pakistan (HRCP) organized a consultation on the rights of persons with disabilities in Lahore. The event was attended by physically challenged individuals, representatives of organizations working for persons with disabilities (PWD), lawyers, psychiatrists and civil society groups.

Speakers at the consultation said that despite Pakistan's ratification of the United Nations Convention on the Rights of Disabled Persons in July 2011, the country was yet to make progress on conditions it was required to fulfill under the convention. Some of the issues of import raised at the consultation were the lack of assistance afforded to PWDs during state-held exams, difficulty in obtaining special identity cards, and lack of facilities and funds in schools for the disabled.

During a presentation, the director of Karachi-based Network of Organizations Working with People with Disabilities (NOWPDP), stated that according to official data, the education and employment rate among the PWDs was 3%. Their population in Pakistan was estimated to be around 20 million but only 0.6 million were registered with the National Database and Registration Authority (NADRA).

The participants recommended that during the next census, scheduled to be held in 2016, the government should for the purpose of data collection introduce a separate and detailed category of persons with disabilities in order to accurately assess not just their numbers but educational and employment status. Regarding their civil and political rights, the participants suggested that polling stations should be easily accessible and that appropriate provisions should be made to allow the PWDs to cast their vote without assistance to ensure impartiality.

One of the speakers, a high court lawyer, spoke of lacunas in the law as a result of which a mentally challenged person could be executed. The law expert said that there were no effective safeguards to prevent a mentally challenged person from being charged with blasphemy, as had been observed in at least eight cases in Pakistan in the last decade.

The difficulties for the physically challenged persons in accessing buildings, including public buildings and the inability of the building authorities across the country to implement building codes that facilitated access for persons with disabilities were highlighted.

The participants flagged in particular the difficulties in travelling to and from work and educational institutions as major challenges. They spoke about implementation of the job quota reserved for persons with disabilities and also called for creating awareness about their challenges and for enabling them to fully contribute to society.

The participants stressed the need for the introduction of a uniform policy on PWDs across all provinces of Pakistan.

Human Rights Commission of Pakistan
جہد حق Monthly JEHD-E-HAQ

Monthly JEHD-E-HAQ - September 2015 - Registered No. CPL-13

جلد نمبر 22..... شمارہ نمبر 09 .....ستمبر 2015..... قیمت 5روپے

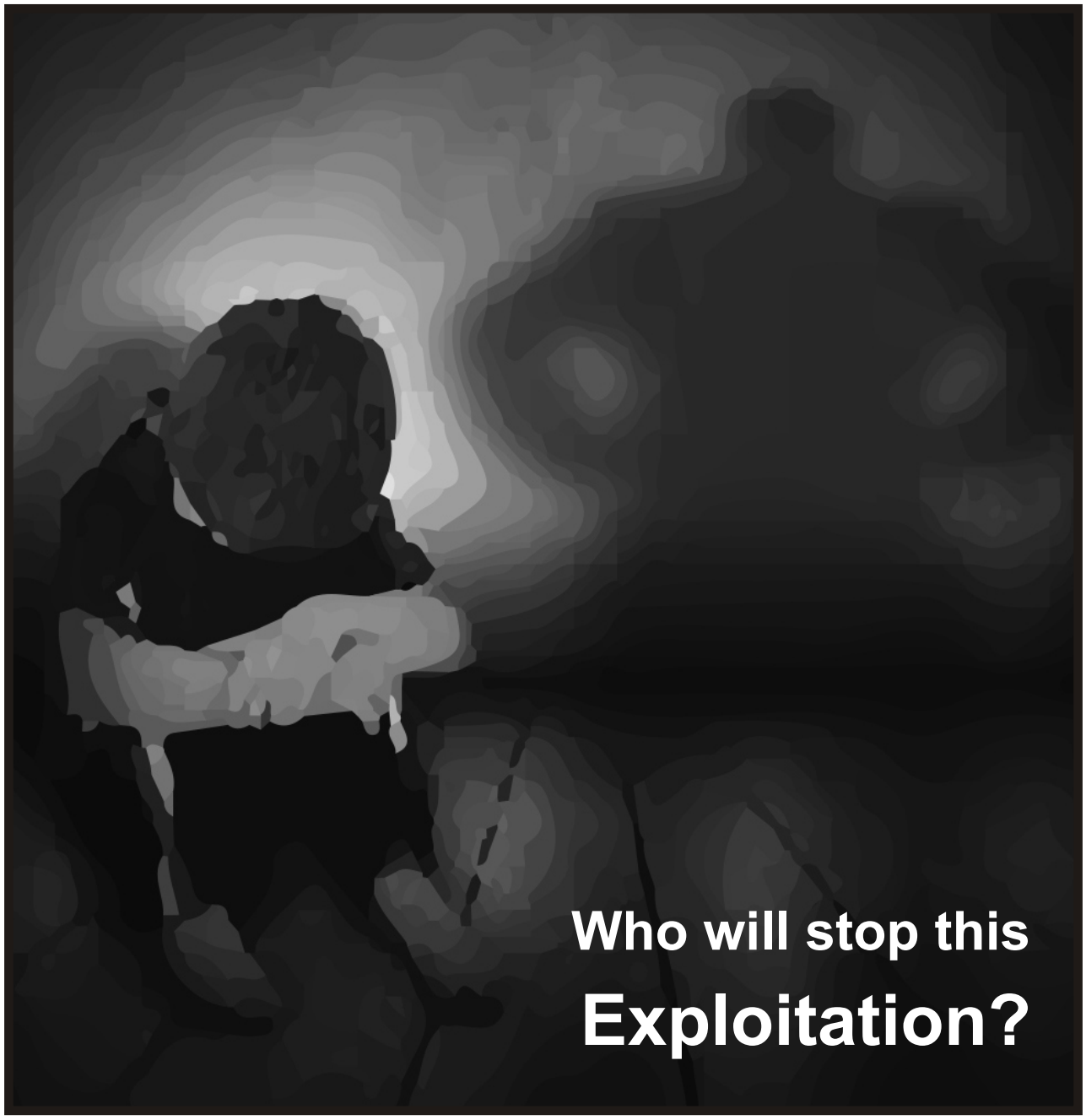

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدیدپریس، 14ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15